

جاسوسی دنیا نمبر 55

سمائے کی لاش

(مکمل ناول)

پُر اسرار عورت

اس بار بہت زور سے بجلی کڑکی اور گھوڑا گرتے گرتے بچا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ہوا کا زور..... رات کا اندھیرا۔

وہ ایک طوفانی رات تھی مگر شاید گھوڑا بھی طوفان سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے سوار کو اس طرح اڑائے جا رہا تھا جیسے وہ بھی اس ہنگامہ خیز رات کا ایک جزو ہو۔ بیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی اس کے پیرست نہیں ہوئے تھے۔ اندھیرے میں اس طرح فراٹے بھرنے سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس کا جانا پہچانا راستہ ہے، سوار کی حالت البتہ ابتر تھی۔ وہ گھوڑے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا، اُسے ہوش ہی نہیں تھا کہ لگام کب اور کیسے اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ لگام کہیں گر ہی گئی ہوگی، ورنہ کہیں نہ کہیں گھوڑا اس سے الجھ کر گرا ضرور ہوتا۔ یہی غنیمت تھا کہ سڑک زمین کی سطح سے کافی اونچی تھی اور اس پر پانی نہیں اکٹھا ہوا تھا، ورنہ وہ اس رفتار سے دوڑ بھی نہ سکتا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگلوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک ایک لحظہ کے لئے انہیں چمکا دیتی اور پھر وہ اسی گھنے اندھیرے اور بارش کے شور میں کھو جاتے۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی ”تڑاک..... تڑاک“ بارش کے شور کے باوجود بھی دور ہی سے سنی جاسکتی تھی۔

گھوڑا دھڑاتا رہا۔ بادل چمکھڑتے رہے اور ہوا کی شائیں شائیں بارش کے شور کو اور زیادہ بھیا تک بناتی رہی۔

سوار کو ہوش نہیں کہ گھوڑا کب شہر کی حدود میں داخل ہوا۔ بارش کا ہیجان اب کچھ کم ہو گیا تھا لیکن گھوڑے کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی کیونکہ سڑکیں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ ویسے ابھی اتنی رات نہیں گئی تھی کہ سڑکیں ویران ہو جاتیں۔

بارش اور ہوا کے زور نے بجلی کے تاروں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ نتیجے کے طور پر شہر کے بعض حصے بالکل ہی تاریک ہو گئے تھے۔

گھوڑا اب جس حصے سے گذر رہا تھا وہاں زیادہ تر متمول لوگ آباد تھے، وہ ایک عمارت کی کمپاؤنڈ کے پھاٹک میں گھس پڑا۔ اب اس کی رفتار سست ہو گئی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اب وہ گری پڑے گا۔ پورٹیکو میں پہنچ کر وہ شاید اپنی پوری قوت سے ہنہانیا اور اس کے حلق سے کریناک آوازیں نکلتی رہیں۔

اچانک تاریک برآمدے میں بہت سے قدموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کئی ٹارچیں روشن ہوئیں اور کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ ”میرا بچہ۔“

سوار ابھی تک گھوڑے کی گردن ہی سے لپٹا ہوا تھا۔ چار آدمیوں نے اسے اتارا اور گھوڑے نے زمین پر بیٹھ کر اپنی گردن ایک طرف ڈال دی۔

عورت سسکیاں لے رہی تھی۔ کیونکہ اس نے بیہوش نوجوان کا خون میں بھیگا ہوا شانہ دیکھ لیا تھا۔

اُسے ایک کمرے میں لے جا کر مسہری پر ڈال دیا گیا۔ یہ چاروں آدمی خوش پوش اور مہذب تھے۔ انہیں گھر کے ملازموں میں سے نہیں سمجھا جاسکتا تھا، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سب اس عورت کا احترام کرتے ہوں۔ عورت دراز قد اور بھرے ہوئے جسم کی تھی۔ پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرہ اس عمر میں بھی پرکشش تھا، لیکن اس پر اذیت

ہندی کی ساری علامتیں موجود تھیں۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ، بھاری جڑے، چمکیلی اور بے چین آنکھیں جن میں اس وقت آنسو تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن سے کوئی غیر فطری فعل سرزد ہو رہا ہو۔ یعنی آنسو ہونے کے باوجود بھی وہ روتی ہوئی سی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

اُن میں سے ایک آدمی نے نوجوان کا زخمی شانہ کھول دیا تھا اور زخم کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ٹوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر سکتی ہوئی عورت سے کہا۔

”مختہ متویر..... یہ کسی جانور کے دانتوں کے نشانات ہیں۔“

”اوہ.....!“ عورت نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور خود بھی جھک کر خون بھرے ہوئے حصے کو دیکھنے لگی۔

”ہاں یہ دانتوں ہی کے نشانات ہو سکتے ہیں۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

نوجوان کے جسم کا اوپری حصہ برہنہ کر دیا گیا تھا۔

”آپ باہر تشریف لے جائیے، تاکہ جھیکے ہوئے کپڑے اتار سکیں۔“ ایک آدمی نے عورت سے کہا اور وہ کمرے سے چلی گئی۔

وہ اس کے جھیکے ہوئے کپڑے اتار کر اُسے ایک خشک چادر سے لپیٹنے لگے۔

”کسی جنگلی درندے کے دانت۔“ ایک بڑبڑایا۔

”نہیں! میرا خیال ہے کہ یہ کسی جنگلی درندے کے دانت نہیں ہیں، ورنہ شانے کی ہڈی

مخروط نہ رہتی۔ ہاں بھیڑیے کے امکانات ہو سکتے ہیں، مگر اپنی طرف کے بھیڑیے اتنے

خطرناک نہیں ہوتے کہ بڑی عمر کے آدمیوں پر اس طرح حملہ کر بیٹھیں۔ رپچھ کے متعلق سوچا

بھی نہیں جاسکتا کیونکہ بقیہ جسم بے داغ پڑا ہوا ہے۔ اس کے ناخنوں کی ڈالی ہوئی خراشیں کافی

گہری ہوتی ہیں اور حملے کے وقت وہ اپنے بڑے بڑے ناخن ضرور استعمال کرتا ہے۔ دوسرے

وحشی درندوں میں تیندوا سب سے زیادہ ہلکا جانور ہے، لیکن اُسکے جیزوں کی گرفت بھی ہڈیاں

توڑ دیتی ہے۔“

”پھر.....!“ ایک آدمی نے سوال کیا۔

”یہ تو حضرت ہوش میں آنے کے بعد بتا سکیں گے۔ کسی کا کہنا ماننا تو جانتے ہی نہیں، جو

دھن سوار ہوئی تو ہوئی۔ اس موسم میں انہیں شکار سے باز رہنے کو کہا گیا۔ پتہ نہیں راقفل کہاں چھوڑی، نوکروں اور خیمے کا کیا حشر ہوا۔

”محترمہ تنویر بہت پریشان ہیں۔“

”لیکن.....!“ ایک آدمی نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا اُنکے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔“

”نہیں! وہ اپنے سینے میں فولاد کا دل رکھتی ہیں۔“ ایک آدمی نے درشت لہجے میں کہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے وہ سوال ناگوار گذرا ہو۔ یہ ایک معمر مگر تندرست آدمی تھا۔

وہ پھر بیہوش نوجوان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ ایک کافی قبول صورت نوجوان تھا۔ عمر بیس بائیس سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ چہرے پر صحت مندی کے آثار تھے اور جسم گھٹایا تھا۔ جسم کی بناوٹ یہی کہتی تھی کہ وہ ورزشوں کا عادی ہے۔

”اوہو.....!“ ایک آدمی نے کہا۔ ”ہم کیا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو فون کرنا چاہئے۔“ اچانک قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑے۔ تنویر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ”نہیں اب آپ لوگ تکلیف نہ کریں۔ میں خود ہی دیکھ لوں گی۔ آپ اپنے کمروں میں جا سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

وہ چاروں چپ چاپ باہر نکل گئے۔ اُن کے کمروں میں جانے کا یہ مطلب تھا کہ اب وہ تنویر کی اجازت حاصل کئے بغیر رات بھر کمروں سے باہر نہ نکل سکیں گے۔ ان کے لئے اس عجیب و غریب عورت کی طرف سے یہی حکم تھا۔

تنویر چند لمحے اپنے بیہوش اکلوتے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی پھر کمرے سے نکل گئی۔ اُس نے شاید اُن چاروں کی ساری گفتگو سن لی تھی۔

وہ متعدد کمروں سے گذرتی ہوئی ایک نیم تاریک کمرے میں آئی۔ یہاں کے بلب پر کچھ اس قسم کا شید لگایا گیا تھا کہ روشنی ایک محدود دائرے میں تھی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی

ایک تاریک گوشے سے عجیب طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ سیٹیاں..... سسکاریاں اور ایسی آوازیں، جو کسی آدمی کے بند ہوتے ہوئے حلق سے نکل رہی ہوں۔

تنویر اس تاریک گوشے کی طرف بڑھی۔ آوازیں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئیں، تنویر نے ہمارے لٹکا ہوا چمڑے کا ایک بڑا سا چابک اتارا اور اُسے تاریک گوشے کی طرف گھمانے لگی۔ ”شائیں..... شائیں..... شائیں..... شائیں۔“

آوازیں آنی بند ہو گئیں اور کمرے میں پھر پہلے ہی کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ ”مڈونگا.....!“ تنویر کی آواز کمرے میں گونجی۔ ”میرے بچے کو کسی جنگلی درندے نے زخمی کر دیا ہے۔“

”مر جانے دے۔“ تاریک گوشے سے اس قسم کی آواز آئی جیسے ریلوے انجن نے اسٹیم چھوڑی ہو۔

جواب میں تنویر نے پھر اسی گوشے کی طرف چابک گھمایا اور سناٹا چھا گیا۔ ”سن مڈونگا.....!“ تنویر نے پروقار آواز میں کہا۔ ”تجھے بتانا پڑے گا کہ میرا بچہ کیسے زخمی ہوا ہے۔“

”نہیں بتاؤں گا..... نہیں بتاؤں گا۔“ سیٹیاں اور سسکیاں پھر گونجیں۔ ”تو مجھے اپنے پیر نہیں چاہئے دیتی۔ میں نہیں بتاؤں گا۔“

تنویر نے پھر چابک گھمایا اور تاریک گوشے سے آواز آئی۔ ”مارڈال..... مجھے مارڈال۔“ ”تجھے بتانا پڑے گا۔“ تنویر غرائی۔ ”مڈونگا..... پیر چائے گا۔“

تنویر چند لمحے خاموش رہی۔ پھر اُس نے داہنے پیر سے سینڈول اتار کر اُسے تاریکی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خود روشنی میں تھی اور ایک پیر پر کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار تھے جیسے وہ بڑی کراہیت محسوس کر رہی ہو۔ اندھیرے سے عجیب قسم کی غراہٹ بلند ہو رہی تھی اور ساتھ ہی ”چڑچڑ“ کی آوازیں جیسے کتابانی لپا رہا ہو۔

”ختم کرو۔“ تھوڑی دیر بعد تنویر نے جھنجھلا کر کہا اور اپنا پیر کھینچ لیا۔ پیر بھیگا ہوا تھا اس نے وہ پیر دوبارہ سینڈول میں نہیں ڈالا اور ساری کو بھی اس طرح ٹخنوں کے اوپر اٹھائے رہی جیسے وہ پیر

”کتا زہر ملا ہے..... میں رات بھر اس کے زخم چوسوں گا اور یہ صبح تجھے ٹھیک ملے گا۔“

میاں سے چلی جا۔“

”تو رات بھر یہاں اس کمرے میں نہیں رہ سکتا۔“ تنویر نے کہا۔

”اچھا تو پھر میں اسے لے جا رہا ہوں۔“

”لیکن اگر اُسے ہوش آ گیا تو۔“

”میرے کمرے میں اندھیرا ہوگا تنویر۔ اگر اُسے ہوش آ گیا تو میں اسے باہر ڈال دوں گا۔“

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر تنویر نے کہا۔

”اچھا..... تو یہی کر..... لیکن یاد رکھ اگر میرا بچہ مر گیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دوں گی۔“

جواب میں ایک عجیب سی آواز گونج کر رہ گئی۔ شاید یہ اُس پر اسرار، سستی کا قہقہہ تھا۔ تنویر خاموش رہی۔ پھر ”چٹ چٹ“ کی آواز اس کے قریب سے گذر کر کمرے سے باہر جاتی معلوم ہوئی۔ جب آواز آئی بند ہو گئی تو تنویر نے سوچ آں کر دیا۔

مسہری خالی تھی۔ تنویر نے تشویش آمیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور ایک کرسی میں گر گئی۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار تھے۔

وہ ایک مضبوط دل کی عورت تھی۔ بعض لوگ تو اُسے سکندر تک کہہ بیٹھتے تھے لیکن اس کے چاروں مشیروں نے آج پہلے پہل اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے پہلی بار اُس کی سسکیاں سنی تھیں۔ اپنے شناساؤں میں وہ ایک پر اسرار عورت سمجھی جاتی تھی۔ وہ پر اسرار ہی سہی مگر وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اسکی کئی فیکٹریاں اور ملیں تھیں۔ شہر کی متمول ترین ہستیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ اُس کا حلقہ احباب محدود تھا۔ چند گئے چنے آدمی اکثر اس کی کوشی میں دیکھے جاتے۔ یہ بھی وہ لوگ تھے جنہوں نے زبردستی مادام تنویر سے تعارف حاصل کیا تھا، ورنہ وہ خود کسی سے کبھی نہیں ملتی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے ملازموں بلکہ لڑکے کے لئے بھی انتہائی پر اسرار تھی۔ اس کی کوشی کا ایک حصہ ایسا بھی تھا جہاں کوئی نہیں جانے پاتا تھا اور یہ حصہ وہی تھا جہاں کچھ دیر پہلے چابکوں کی ”شائیں شائیں“ گونجتی رہی تھی۔ تنویر کے علاوہ اور کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہاں کیا ہے۔ ویسے باورچیوں کو روزانہ تقریباً دس سیر گوشت کے پارچے اس طرح انگاروں پر بھوننے پڑتے تھے کہ

کسی بہت ہی گندی چیز میں جا پڑا تھا۔

”شائیں.....!“ اندھیرے میں پھر ایک بار چابک گھملا گیا اور تنویر غرائی ”مڈونگا..... باہر نکل۔“

”اندھیرا..... تنویر..... اندھیرا.....!“ وہی سسکارتی ہوئی آواز اندھیرے سے آئی۔

تنویر نے آگے بڑھ کر سوچ آف کر دیا۔ کمرے کا روشن حصہ بھی تاریک ہو گیا اور تنویر وہاں سے چل پڑی۔ وہ جس کمرے سے بھی گذرتی اُس کا بلب بجھاتی جاتی۔

اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر اندھیرے میں کوئی چیز رینگ رہی تھی، جس کے حرکت کرنے سے ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی۔ ”چٹ..... چٹ..... چٹ۔“

زخمی کے کمرے میں پہنچ کر اُس نے وہاں بھی اندھیرا کر دیا اور دروازے کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ”چٹ..... چٹ۔“ کی آواز اس کمرے میں بھی داخل ہوئی لیکن ٹھیک اسی جگہ غائب بھی ہو گئی جہاں تنویر کھڑی تھی۔

”مڈونگا..... کیا تو میرے بچے کی بو محسوس کر رہا ہے۔“ تنویر نے کہا۔

”ہاں..... کر رہا ہوں۔“

”دیکھ..... اُسے کیا ہوا ہے۔“

”چٹ چٹ۔“ کی آواز پھر کمرے میں گونجنے لگی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہی پہلے کا سا

سناٹا طاری ہو گیا۔

شاید ایک منٹ بعد سسکاریاں اور سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔

”تنویر.....!“ اندھیرے سے آواز آئی۔ ”کتا..... یہ کسی کتے کے دانت ہیں۔ تیرا بچہ

مر جائے گا۔“

”کیا بکتا ہے.....!“ تنویر چیخی۔

”ہاں مر جائے گا..... مگر مڈونگا اُسے بچا سکتا ہے۔ بچا سکتا ہے تنویر۔“

”بچا لے مڈونگا۔“ تنویر گھمکھائی۔

”مگر میں روزانہ تیرے پیر چائوں گا۔“

”اچھا نور کے بچے۔“

بھن جانے کے بعد اُن سے خون ٹپکتا رہے یعنی آدھ کپے پارچے اور وہ سارے کا سارا گوشہ خود تویر اٹھا کر عبارت کے اس حصے میں لے جایا کرتی تھی۔

اس کے علاوہ آج تک وہاں پندہ بھی پر نہیں مار سکا تھا۔ اکثر اُس حصے کی طرف سے عجیب و غریب آوازیں لوگ سنتے اور سہم جاتے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اُس حصے کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ تویر کا خوف اس طرح ان لوگوں پر غالب تھا۔

دوسروں پر حکومت کرنے والی تویر کی یہ رات بڑی بے چینیوں میں گزری جا رہی تھی۔ وہ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی..... کبھی بیٹھ جاتی۔ کبھی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہو جاتی اور کیاؤنڈ میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں اس طرح گھورنے لگتی جیسے اُسے کسی کی تلاش ہو۔

اچانک اُس کے کتوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور تویر بھپٹ کر ایک الماری کے قریب پہنچی۔ اُسے کھول کر ایک ریو اور نکالا۔ کمرے کی روشنی گل کر دینے کے بعد وہ پھر کھڑکی کے قریب آ گئی۔ کتے بدستور بھونکے جا رہے تھے۔

آج یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کتے روز ہی رات کو اسی طرح اچانک بھونکنے لگتے تھے لیکن اس سے پہلے کبھی تویر کو ریو اور نکالنے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی۔

دونج گئے تویر ابھی تک جاگ رہی تھی وہ اپنے لڑکے عدنان کے لئے بہت پریشان تھی اور ایک فکر مند ماں کی طرح بہتری اچھی اور بُری باتیں سوچ رہی تھی۔

اچانک اُس نے عدنان کی چیخیں سنیں، روشنی لاؤ..... روشنی لاؤ..... میں کہاں ہوں..... یہاں بہت اندھیرا ہے..... کیا میں اندھا ہو گیا ہوں۔“

آواز بڑی تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں تویر راہداری میں تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی عبارت کے اُسی پر اسرار حصے کی طرف جا رہی تھی جہاں اُس نے کسی پر چابک برسائے تھے۔ تاریک راہداریاں منور ہوتی چلی گئیں۔ پھر اُسے عدنان نظر آیا۔ جو ایک دیوار کا سہارا لئے لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”عدنان.....!“ تویر چیخی اور عدنان اپنے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تویر نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔

”تو میں گھر ہی میں ہوں۔“ عدنان کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے تویر لکھتے بدل گئی ہو۔ اس نے پیشانی پر پل ڈال کر کہا۔

”میں تم سے بہت ناراض ہوں عدنان۔“

”نہیں! می ڈیر! تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ میں واپس آ گیا۔ میرا گھوڑا کہاں ہے اور میری رائفل۔“

”گھوڑا اصطبل میں ہوگا..... رائفل کے متعلق مجھے علم نہیں۔ میں نے تمہیں اس شکار سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا تمہیں علم تھا می کہ مجھے یہ حادثہ پیش آئے گا۔“ عدنان نے اُسے گھور کر پوچھا۔

”چلو..... اپنے کمرے میں چلو۔ تم کمزوری محسوس کر رہے ہو۔“

”میری بات کا جواب دو می..... کیا تمہیں علم تھا۔“

”شٹ آپ.....“

عدنان خاموش ہو گیا۔ لیکن اُس کے چہرے پر پائے جانے والے آثار یہی کہہ رہے تھے

کہ وہ اپنی ماں کی ڈکٹیٹر شپ پسند نہیں کرتا۔ وہ اُسے اُسی کمرے میں لائی جہاں کچھ دیر قبل خود

بیٹھی تھی اور اُسے آرام کرسی میں دھکیلتی ہوئی بولی۔ ”مجھے بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔“

”مجھے یاد نہیں..... ادھ می..... اب میں سونا چاہتا ہوں۔ اف فوہ..... کتنی جلن ہے میرے

شانے میں۔“

”تم مجھے بتائے بغیر نہیں سو سکو گے، مجھے تمہاری یہ خود سری بالکل پسند نہیں ہے۔“

”سونے کی خواہش کرنا خود سری نہیں ہے۔ تم اب تک کیوں نہیں سوئیں۔“

”میری بات کا جواب دو۔ تم بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔“

”میں شاید موت کے منہ سے نکل کر آیا ہوں می!“ عدنان نے خشک لہجے میں کہا۔

”ہاں میں جانتی ہوں..... مجھے اس کے متعلق بتاؤ۔“

”صبح بتاؤں گا..... اب مجھے سونے دو۔“

”تم بتائے بغیر نہیں سو سکتے۔ اگر مجھے تیسری بار بھی یہی دہرانا پڑا تو میں بہت بُری طرح

پیش آؤں گی۔ موت کے منہ میں جانا اور نکل آنا مردوں ہی کا کام ہے۔ اگر تم لڑکی ہو تو میں کچھ پوچھنے بغیر ہی تمہیں تھک کر سلا دیتی۔“

”میں نہیں جانتا کہ ماں کی شفقت کس چڑیا کا نام ہے۔“ عدنان برا سامنہ بنا کر بولا۔
”تم حقیقتاً بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔ میں تم سے کبھی نہ بولوں گی۔“ تنویر نے اٹھ ہوئے کہا۔

”اوہو! مٹی خفا ہو گئیں۔“ عدنان بے بسی سے بولا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ بتاتا ہوں..... میں تنہا شکار کے لئے نکل گیا تھا۔ نوکر خیمے میں تھے اور خیمہ مجھ سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک کتے نے پیچھے سے گھوڑے پر حملہ کیا اور گھوڑا بدک کر بھاگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ کوئی جنگلی کتا نہیں معلوم ہوتا تھا..... حقیقتاً کسی کا پالتو تھا۔ مگر جنگل میں۔ میرا مطلب ہے کہ وہی آبادیوں میں ایسے کتے نہیں دکھائی دیتے۔ میرا گھوڑا بے تحاشہ دوڑ رہا تھا، لیکن کتے سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ایک بار کتے نے چھلانگ لگائی اور مجھ پر آ رہا۔ شاید اس کا حملہ میری گردن ہی کے لئے تھا۔ لیکن اس کے دانت شانے ہی میں اترتے چلے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ میں نے اُسے کس طرح جھک دیا تھا۔ گھوڑا دوڑتا ہی رہا..... پھر بارش شروع ہو گئی۔ نہ جانے کیوں مجھ پر غشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا..... یہ بتاؤ میرا گھوڑا زندہ ہے یا مر گیا۔“
”مجھے علم نہیں ہے۔“

”علم ہونا چاہئے..... مٹی وہ ایک بڑا شاندار گھوڑا ہے۔ اسی نے آج میری جان بچائی ہے۔“
”وہ کتا کیسا تھا.....؟“

”اوہ..... وہ..... اس کا رنگ سیاہ تھا..... اور جسم کی بناوٹ گرے ہاؤنڈ کی سی تھی۔ لیکن میں نے آج تک سیاہ رنگ کا گرے ہاؤنڈ نہیں دیکھا۔“
”کیا اس کے سر پر سفید دھاریاں بھی تھیں۔“

عدنان تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میں نے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے دھاریاں رہی ہوں..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... تمہیں اتنا ہوش کہاں رہا ہوگا کہ یہ دیکھتے۔“ تنویر نے برا سامنہ بنا کر کہا۔
”تم تو کسی ننھی سی بچی کی طرح خوفزدہ ہو گئے تھے۔ عدنان کیا تمہیں ریوالور کی مشق نہیں ہے۔“
”ہے کیوں نہیں..... کیا تم یہ سمجھتی ہو مٹی کہ میں ڈر کر بھاگا تھا۔ گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا۔ پھر لوٹان آ گیا۔ اگر تم اس طرح طر کر دو گی تو میں ابھی اور اسی وقت شکار گاہ واپس جاؤں گا۔“
”عاموش بیٹھو۔“ تنویر نے اُسے جھڑک دیا۔ چند لمحوں پہلے چپ رہی پھر پوچھا۔ ”اس کتے کے ہاتھ کوئی آدمی بھی نظر آیا تھا۔“

”میں نہیں دیکھ سکا۔“ عدنان نے جواب دیا پھر بولا۔ ”کیا تم اس کتے کے متعلق کچھ جانتی ہو۔“
”کیوں.....؟“ تنویر اُسے گھورنے لگی۔
”تم نے ابھی سفید دھاریوں کے متعلق پوچھا تھا۔“
”کچھ نہیں..... بونہی۔“
”مجھے بتاؤ کہ وہ کس نسل کا کتا تھا۔“

”میں نہیں جانتی، لیکن اب تم میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلو گے..... سمجھے!“
”کیوں..... مجھے وجہ بتاؤ۔“
”تم واقعی بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔“

”مٹی ڈیرا تم ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتی ہو۔ میں تمہاری پریشانی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تم کئی دنوں سے پریشان نظر آ رہی ہو۔“
”تم مجھے پریشان نہیں دیکھنا چاہتے..... کیوں؟“
”قدرتی بات ہے مٹی۔“

”اچھا تو میں اس طرح خوش رہ سکتی ہوں کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو۔“
”یعنی تمہاری اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ نکالوں۔“

”ہاں..... میں یہی چاہتی ہوں۔“
عدنان نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تم نے مجھے وہاں اندھیرے میں کیوں ڈال دیا تھا۔“

”ڈاکٹر نے یہی کہا تھا کہ تمہیں اندھیرے میں ہوش آنا چاہئے۔“

”اندھیرا تو میرے کمرے میں بھی ہو سکتا ہے۔“

”تم پھر بحث کرنے لگے۔“

”ہاں تو میں تم سے کچھ پوچھا ہی نہ کروں۔“ عدنان نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”نہ پوچھا کرو۔“

”تم ابھی تک مجھے ایک ننھا سا بچہ سمجھتی ہو۔ یہ مجھے پسند نہیں ہے۔“

”میری پسند تمہاری پسند ہے..... اُسے ہمیشہ یاد رکھنا۔ اب سو جاؤ۔“ تویر اٹھتی ہوئی بولی۔

عدنان خاموش ہی رہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دباکر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

تویر اُس کے کمرے سے نکل کر پھر عمارت کے اُسی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔

”مُدوٹکا! مُدوٹکا!“ اُس نے آہستہ سے آواز دی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ دو تین بار آواز دینے کے بعد وہ پھر رہائشی حصوں کی طرف پلٹ آئی۔

اب پھر بوندا باندی شروع ہو گئی تھی اور آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تویر بیرونی برآمدے میں نکل آئی۔ کیا ڈغڈغ سنسان پڑا تھا۔ درختوں سے بوندوں کے گرنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی گذر رہی تھی۔

تویر نے برآمدے کے بلب نہیں روشن کئے۔ وہ ٹوٹتی ہوئی آگے بڑھی اور ایک آرام کرسی میں لیٹ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صبح چوکیدار کی بُری طرح خبر لے گی کیونکہ اُن میں سے شاید ایک بھی نہیں جاگ رہا تھا۔

ریوالور تویر کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ آج سے پہلے کبھی وہ اس طرح برآمدے میں آ کر نہیں بیٹھی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ذہن مختلف قسم کے خیالات میں بُری طرح الجھا ہوا تھا مگر وہ خائف نہیں تھی۔

وہ بڑی پراسرار عورت تھی۔ اُس کا لڑکا عدنان بھی اُس کے کسی راز سے واقف نہیں تھا۔

یہیں جانتا تھا کہ اُس کی ماں کون ہے! کیا ہے؟ وہ اپنے باپ کے متعلق بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ ہے کہ اُسے اپنے باپ کا نام تک نہیں معلوم تھا۔

ہم شکل مردہ

کرنل فریدی آفس میں اپنی میز پر اخبار پھیلانے بیٹھا تھا۔ حمید اور رمیش اپنی میزوں پر تھے۔ رمیش کاغذات میں الجھا ہوا تھا اور حمید..... وہ تو اب محض فریدی کو چڑھانے کے لئے ”ٹوٹو پلے پن اپ“ کے پرچے آفس میں بھی لانے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہ پرچے کی درق گردانی کر رہا تھا۔ اس میں ہالی وڈ کی ایکٹریوں کی نئی نیم عریاں تصاویر تھیں۔ کبھی کبھی وہ دور ہی سے رمیش کو بھی کوئی پوز دکھانے لگتا۔ فریدی اخبار میں مچوٹا۔

اچانک لیڈی انسپکٹر ریکھا کمرے میں گھس آئی۔ اُس کا چہرہ سرخ تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی اخبار پر جھک پڑی۔

فریدی نے اُسے تنکھی نظروں سے دیکھا۔ اُسے ریکھا سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ آج وہ اجازت لے کر بھی کمرے میں داخل نہیں ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے۔“

”اوہ..... میں معافی چاہتی ہوں۔“ ریکھا شپٹا گئی۔ ”لیکن بات ایسی ہی ہے۔“

”کیا بات ہے..... بیٹھ جاؤ۔“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

حمید نے میز کی دراز سے دو تین پرچے اور نکال لئے۔ آج کل ریکھا سے اُس کی بول چال نہیں تھی اور جھگڑے کی وجہ قاسم تھا۔ قاسم آج کل زیادہ تر حمید ہی کے ساتھ رہتا اور ریکھا پر خاص طور سے اس کی نظر غائب تھی بلکہ وہ حمید کے ساتھ اپنا زیادہ تر وقت اسی لئے گزارتا تھا کہ شاید ریکھا کا دیدار ہی نصیب ہو جائے مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

اس جھگڑے سے پہلے وہ تینوں کبھی کبھی کینے یا ہوٹل میں مل بیٹھا کرتے تھے۔ ریکھا قاسم

”ریش.....!“ فریدی نے کہا۔ ”انہیں سمیٹ کر باہر پھینک دو۔“

ریش اٹھ کر پرچے سمیٹنے لگا اور فریدی نے ریکھا سے کہا۔ ”ہاں تم سیکھ کہہ رہی تھیں۔“
ریکھا، جو ریش کو پرچے سمیٹتے دیکھ رہی تھی چونک پڑی۔ ”جی ہاں! آپ یقین کیجئے میں نے اس کی لاش دیکھی تھی۔“

”کب دیکھی تھی..... اور پھر تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ اُسی کی لاش رہی ہوگی۔“

”اگر وہ محض مشابہت تھی تو مجھے حیرت سے بھی زیادہ کچھ اور ہونا چاہئے۔“

”ہاں..... آں..... اکثر ایسی مشابہتیں بھی ہوتی ہیں۔ خود میرے تجربے میں ایسے واقعات آئے ہیں۔ میرے کئی کیسوں میں ایسی شکلیں سامنے آچکی تھیں۔“

”مگر جناب! وہ مشابہت ہی سہی۔ میں نہ جانے کیا محسوس کر رہی ہوں۔“

”اس لائن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ہم اسے چھٹی حس کہتے ہیں۔ خیر تم کیا محسوس کر رہی ہو۔“

”دیکھئے بتاتی ہوں۔“ ریکھا نے کہا پھر ریش کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم نے بھی اس مفلوج

فقیر کو صدر کے علاقے میں کہیں کہیں ضرور دیکھا ہوگا، جو بڑی عجیب قسم کی دعائیں دیا کرتا تھا۔“

”جی ہاں..... میں نے دیکھا ہے۔“ ریش نے جواب دیا۔

”ذرا یہ تصویر دیکھنا۔“

”ریش اٹھ کر میز کے قریب آ گیا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے تصویر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر

بولا۔ بڑی مشابہت ہے بلکہ بعض حالات میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں سرمو فرق نہیں۔“

”مگر یہ فقیر تمہیں یاد کیسے رہ گیا۔ دن بھر سینکڑوں فقیر تمہاری نظروں سے گزرتے ہوں گے۔“

”جناب! وہ فقیر ہی عجیب ہے۔“ ریش نے کہا۔

”ہے نہیں بلکہ تھا..... کیونکہ میں اس کی لاش دیکھ چکی ہوں۔“

”کب..... کیا وہ مر گیا۔“ ریش نے پوچھا۔

”غائب! پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ پھر میں نے اس آدمی کو۔“ ریکھا نے تصویر کی طرف

اشارہ کیا۔ ”کل شام ایک کار سے اترتے دیکھا۔ اگر میں اس فقیر کی لاش نہ دیکھ چکی ہوتی تو.....

کی حماقتوں سے کافی محفوظ ہوتی، لیکن ایک دن جب حمید اور ریکھا آکلچو میں بیٹھے غریب مار رہے تھے۔ قاسم آگیا اور اچانک ریکھا کی نظر قاسم کی کوٹ کی جیبوں پر پڑی، جو رہ کر پھولتی اور چمکتی ہوئی سی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ ریکھا کے استفسار پر قاسم نے بتایا کہ وہ خرگوش کے بچے لے پھر رہا ہے کیونکہ ریکھا کو خرگوش بہت پسند ہیں۔ شاید ریکھا نے پہلے کبھی کسی موقع پر کہا تھا کہ اُسے خرگوش بہت پسند ہیں۔ اگر امکان میں ہو تو وہ سارا دن خرگوشوں سے کھیلتی رہے۔

قاسم نے اُسے بتایا کہ اُسے بھی خرگوشوں سے اتنی ہی محبت ہے۔ اس سلسلے میں اس نے شاید بوکھلاہٹ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اسے ریکھا سے بھی اتنی ہی محبت ہے، ریکھا اس پر اکڑی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاسم کی گھٹکی بندھ گئی اور حمید اس کی صفائی پیش کرنے لگا۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ اُسی دن سے دونوں میں بول چال بند تھی۔

”ہاں.....!“ فریدی اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”کیا اس اخبار میں کچھ ہے۔“

”جی ہاں..... میں اس تصویر کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ ریکھا نے اخبار کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ..... یہ..... ہاں..... کیوں؟ یہ سعید بابر کی تصویر ہے، جو ابھی حال ہی میں جنوبی افریقہ سے یہاں آیا ہے۔“

حمید نے بہت زور سے اپنے گال پر تھپڑ مارا اور پھر ریش کو غصیلے انداز میں گھونہ دکھانے لگا..... فریدی اُسے سکھوں سے دیکھ کر پھر ریکھا کی طرف دیکھنے لگا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ میں نے کچھ دن پہلے اس آدمی کی لاش دیکھی تھی تو.....!“ ریکھا جملہ پورا نہ کر پائی کیونکہ حمید ریش کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اس اطلاع پر میں اپنا سر بھی منڈوا سکتا ہوں۔“

”نی الحال تم باہر چلے جاؤ۔“ فریدی غریبا۔

”بہت بہتر جناب۔“ حمید پن آپ کے پرچے سنبھالتا ہوا اٹھنے لگا۔ وہ فرش پر گر گئے۔ حمید انہیں اٹھانے کیلئے جھکا۔ کئی پرچے کھل گئے تھے جن میں بڑی بڑی نیم عریاں تصویریں تھیں۔ ”گٹ آؤٹ۔“ فریدی جھلا گیا اور حمید پرچوں کو وہیں فرش پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

آپ خود سوچئے۔“

”ہم..... مجھے بتاؤ کہ وہ فقیر عجیب کیوں تھا۔“

ریکھا اور رمیش ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ پھر رمیش نے کہا۔ ”حمید بھائی نے بھی اس فقیر کو دیکھا ہوگا۔ وہ بہت اچھی طرح بتا سکیں گے۔“

”حمید کو بلاؤ۔“

سارجنٹ رمیش باہر چلا گیا اور فریدی کچھ سوچنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہرہ جرواکراہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ریکھا نے جتنے جوش و خروش کے ساتھ تذکرہ چھیڑا تھا اس کی مناسبت سے وہ توجہ بھی دے رہا تھا۔ اگر وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیتا تو ریکھا کو خواہ مخواہ شرمندگی ہوتی۔ وہ حمید کی آمد کا منتظر رہا۔

حمید رمیش کے ساتھ واپس آیا۔ شاید اس نے فریدی کی جھڑکیوں کا بُرا نہیں مانا تھا کیونکہ وہ اُس وقت بھی بڑے اچھے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ ریکھا سے بول چال بند تھی اس نے آتے ہی ریکھا سے کہا۔

”خواہ مخواہ..... بات کا بتگنڈ بنانے سے کیا فائدہ۔ میں نے بھی اخبار میں سعید بابر کی تصویر دیکھی تھی اور خاموش رہ گیا تھا۔“

”یہاں مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ وہ فقیر اتنی شدت سے لوگوں کے ذہنوں پر کیوں مسلط تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا ان لوگوں نے نہیں بتایا۔“ حمید بولا۔

”ان کا خیال ہے کہ تم ان سے بہتر طریقے پر بتا سکو گے۔“

”ہا.....!“ حمید سر کھچا کر بولا۔ ”وہ کچھ اس انداز میں بھیک مانگتا تھا کہ لوگ کھڑے گھاٹ

شادیاں کرنے پر تزلزل جاتے تھے۔ آپ سنتے تو اسے گولی ہی مار دیتے۔“

”کیا بکو اس ہے۔“

”جی ہاں..... اس کی صدا ہوتی تھی دے جا بابا..... خدا تیری محبوبہ کو سلامت رکھے۔

مندرست ہو گئے۔ وہ کبھی بوڑھی نہ ہو..... بچے نہ بنے..... وغیرہ وغیرہ۔“

فریدی نے رمیش کی طرف دیکھا اور رمیش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ریکھا کھڑکی کے پر دیکھنے لگی تھی۔

”مگر کیا یہ کوئی کیس بن رہا ہے۔“ حمید نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا۔

”شاید بن ہی جائے۔“ فریدی نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوئے..... پن اپ کے پرچے کیا ہوئے۔“ حمید نے رمیش سے پوچھا۔

”باہر پھینک دیئے۔“

”کیا.....؟“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔

”کرنل صاحب نے کہا تھا۔“

”تم یہاں آفس میں اس قسم کی لغویات مت لایا کرو۔“ فریدی نے سخت لہجے میں کہا۔

”ایک کیس کے سلسلے میں لایا تھا جناب۔“ حمید نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور ریکھا مسکرا

پڑی۔ لیکن اس نے منہ بھی پھیر لیا کہ کہیں حمید کی نظر اس کی مسکراہٹ پر نہ پڑ جائے۔

”ہاں تو فقیر کی لاش بھی تم نے دیکھی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”جی..... جی ہاں..... غالباً وہ سردی سے اکثر کھڑکڑ گیا تھا۔ اسکی دونوں ٹانگیں بیکار تھیں۔“

”اچھا..... اور کیا بتا سکتی ہو اس کے متعلق۔“

”اور کیا! اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں نے اس کی لاش سات جنوری کی شام کو

دیکھی تھی۔“

”اچھا تو بس.....!“ فریدی نے سگار کیس سے گیارہ نکال کر اس کا گوشہ توڑتے ہوئے

کہا۔ ”یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ضرور ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ ہمارا محکمہ اس میں دلچسپی

لینے پر مجبور ہو۔“

”مگر یہ سعید بابر افریقہ سے آیا۔“ ریکھا نے کہا۔

”تو کیا ہم پراچان حیا ہے؟“ حمید گردن جھٹک کر بولا۔ ”آیا ہوگا۔“

”میں آپ سے بات نہیں کر رہی ہوں۔“

”میں بھی سن رہا ہوں..... بہر انہیں ہوں۔“

فریدی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اخبار پڑھنے لگا تھا۔ دیکھا اٹھ کر چلی گئی اور حمید اس کی چال کی نقل اتارنے کے سلسلے میں لپکتے لگا۔ اس دوران میں رمیش بھی شاید کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔

”تم سے میں عاجز آ گیا ہوں۔“ فریدی نے اخبار رکھتے ہوئے کہا۔

”عاجزی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ یقیناً آپ مقبول بندے معلوم ہوتے ہیں۔“

”کیوں! آج کہیں سے بھیک مل رہی ہے۔ بہت چمک رہے ہو۔“

”حیلہ روزی بہانہ موت۔ آج کل قاسم کی دو تین خالہ زاد سالیائیں مجھ پر بہت مہربان ہیں اور میں اب اس کا قائل ہو گیا ہوں، خواہ بیوی نہ ہو، لیکن ایک آدھ سالی ضرور ہونی چاہئے۔ کتنی نفیسی ہے اس لفظ میں ”سالی“..... سا..... لی..... لی!“

حمید اس طرح سالی سالی کی ہانک لگانے لگا جیسے اپنی پالتو کتیا کو آواز دے رہا ہو۔

فریدی نے نہایت اطمینان سے اٹھ کر اس کے دونوں کان پکڑے اور اُسے دروازے کی طرف گھما کر کمر پر ایک لات رسید کر دی۔ حمید سنسان برآمدے میں دور تک دوڑتا چلا گیا۔ پھر اُسی رفتار سے لان کی طرف گھوم گیا اور اب وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا ادھر جا رہا تھا جہاں فریدی کی کار کھڑی کی جاتی تھی۔ اُسے علم تھا کہ فریدی ڈیڑھ بجے کے بعد باہر جائے گا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اُس کی کار لے اڑا۔ آخر اس لات کا بدلہ بھی تو ہونا چاہئے تھا۔

اس نے قاسم کے گھر کی راہ لی جہاں آج کل قاسم کی بیوی کی تین عدد خالہ اور ماموں زاد بہنیں مقیم تھیں۔ یہ تینوں ہی بڑی زندہ دل اور خوش مزاج تھیں۔ ویسے قاسم جیسے شخص کی ہم نشینی نے ان صفات کو اور زیادہ چمکا دیا تھا۔

وہاں ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی تفریح ہوتی رہتی تھی۔ مگر اس وقت کی تفریح قطعی خلاف توقع تھی۔ اُس نے قاسم کو پورنج میں چنت پڑا دیکھا جس کے پیٹ پر ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہوا تھا۔ پتھر کیا چٹان کا ٹکڑا کہنا چاہئے جس کا وزن کم از کم پچاس من ضرور رہا ہوگا اور اس پتھر پر قاسم کے دونوں بڑے بڑے تھوڑے برسارہے تھے۔

قاسم کی سالیاں اوپر برآمدے میں حیرت سے منہ کھولے کھڑی تھیں۔ ان کے قریب اس

بچہ بھی تھی مگر اس کا موڈ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج بھی وہی ننھی منی سی گڑیا لگ رہی تھی۔ ایسی خوبصورت عورت حید کی نظر سے کم گذری تھیں۔ مگر بچہ ارہ قاسم کیا کرتا۔ اس کا تو پہاڑ جھگری والا معاملہ تھا۔ وہ تو کوئی اپنی ہی جیسی گرائڈل لڑکی چاہتا تھا۔

حمید کار سے اتر کر سیدھا پور ٹیکو کی طرف چلا گیا۔ قاسم تھوڑا برس آنے والے نوکروں پر بگڑ رہا تھا۔

”اور زور سے..... اے سالو! کیا کھانے کو نہیں ملتا۔“

”ایک سر پر بھی جمادو..... دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا۔

”ارے خدا تمہیں غارت کرے تم آ گئے۔“ قاسم نہ جانے کیوں بوکھلا گیا۔

”ہاں میں آ گیا ہوں اور اس پتھر پر کھڑا ہو کر ایک تقریر کروں گا۔“

”ہائیں..... آؤ اچھا..... تم بھی کیا یاد کرو گے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں کمزور ہوں۔“ قاسم

نے کہا اور پھر نوکروں کو مخاطب کر کے دھاڑا۔ ”ہٹ جاؤ بے۔“

نوکر ہٹ گئے اور حمید پتھر پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُسے کامیابی ہوئی۔ قاسم کی سالیائیں بے تحاشہ ہنس دی تھیں اور بیوی!..... وہ بیچاری تو حمید کی صورت دیکھتے ہی وہاں سے کھسک گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب قاسم کی خیر نہیں۔ آخر کو بیوی ہی تھی۔ ویسے ہی وہ اس کی حماقتوں کی بناء پر دوسروں کے سامنے شرمندہ ہی رہتی تھی۔ اب حمید صاحب بھی تشریف لائے تھے، جو کچھ نہ ہو جاتا کم تھا۔

حمید پتھر پر چڑھنے کو چنہ تو گیا مگر ڈر رہا تھا کہ کہیں ایک بیک قاسم کی ذہنی رو بہک نہ جائے۔ ایسی صورت میں اُسے شہادت ہی نصیب ہوتی پہلے اسکا ارادہ تھا کہ قاسم کا بخیرہ ادھیڑے کا مگر اب یہ خیال ترک کر دینا پڑا۔ پتہ نہیں کب قاسم جھلا کر پتھر سمیت اُسے زمین پر بیچ دے۔

حمید نے جھک کر تینوں کو سلام کیا اور چپ چاپ اتر گیا۔

”اماں..... وہ تقریر.....!“ قاسم نے کہا۔

”تقریر وہاں سے کروں گا۔“ حمید نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”چلو بے! توڑو پتھر!“ قاسم نے نوکروں کو للکارا۔ ”جب تک پتھر نہیں ٹوٹے گا جھٹی نہیں

ملے گی۔

نوکر پہلے ہی سے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے بڑے ملتجیانہ انداز میں لڑکیوں کی طرف دیکھا اور ایک لڑکی نے کہا۔ ”اب اسے ختم کیجئے..... کوئی دوسرا کرتب۔“

”آؤ تم تینوں پتھر پر کھڑی ہو جاؤ۔“ قاسم نے کہا۔

”ہاں..... یہ بڑی معقول بات ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”بلکہ کہو تو اپنی بیوی کو بھی بلا لو۔“

”قاسم نے جھونک میں کہا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ”کون..... بیوی۔“

”کہاں ہے تمہاری بیوی۔“

”ابھی اندر گئی ہے۔“

”کیا.....!“ قاسم طلق پھاڑ کر دھاڑا۔ پھر کروٹ لے کر پتھر کو ایک طرف دھکیل دیا اور خود اٹھتا ہوا بولا۔ ”کیا کہاتم نے۔“

”میں نے کہا تمہاری بیوی کو بھی بلا لو۔“ حمید نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”نائیں..... تم نے اپنی بیوی کہا تھا۔“

”تمہارے سننے میں فرق آیا ہے پیارے۔“

”تم خود ہو گے پیارے۔ میں گردن توڑ دوں گا تمہاری۔“

”اب ریکھا سیدی ہو گئی ہے۔“ حمید نے آہستہ سے کہا ”تمہیں پوچھ رہی تھی۔“

”نہیں! الا قسم۔“ قاسم کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”ہاں..... بس خاموش رہو۔“ حمید نے جواب دیا۔ انکی سرگوشیاں لڑکیوں تک نہیں پہنچی تھیں۔

پھر دونوں ہنسنے لگے۔

”ہاں.....!“ ایک لڑکی بولی۔ ”ابھی تو آپ حمید صاحب کو مارنے دوڑے تھے۔“

”ارے وہ..... وہ تو میں مذاخ کر رہا تھا۔“ قاسم نے جواب دیا۔

”قاسم کے مذاق بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔“ حمید نے اُن میں سے ایک لڑکی کو آنکھ مار

کر کہا۔ ظاہر ہے کہ اُس آنکھ مارنے کا مقصد اپنی بات میں زور پیدا کرنا ہوتا تھا۔ وہ تینوں ہنس

یں، لیکن قاسم نے حمید کو آنکھ مارتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر لڑکیوں کی طرف دیکھا مگر وہ ماننے کی بجائے ہنس رہی تھی۔ قاسم کی کھوپڑی یکھٹ الٹ گئی اور حمید کو بھی دھیان نہیں رہا کہ نے کیا کیا تھا، کیونکہ یہ سب کچھ رواروی میں ہوا تھا۔

اچانک قاسم نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”آؤ..... میرے ساتھ۔“ گرفت اتنی سخت تھی کہ حمید اپنی کلائی ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی۔ مگر وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ ہاتھ پائی میں پنی ہی بے عزتی تھی۔ قاسم اُسے لڑکیوں کے سامنے ہی اٹھا کر بیچ دیتا۔ وہ اُسے عمارت کے عقبی حصے کی طرف لے گیا اور گریبان پکڑ کر جھوڑتا ہوا بولا۔ ”تم نے سلیہ کو آنکھ کیوں ماری تھی۔“

اب حمید کو یاد آیا اور اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آسمان سر پر گرنا محسوس ہونے لگا۔ جس وقت قاسم غصے میں ہو اُسے کوئی بات سمجھ لینا آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال حمید نے ہاتھ پاؤں مارے۔ ”ارے! یار تم بالکل ہی بھولے ہو..... کیا وہ بُرا مان گئی تھی۔“

”مانے یا نہ مانے..... لیکن تم نے کمینہ بن کیوں کیا۔“

”اگر یہ کمینہ بن ہوتا تو ضرور بُرا مانتی..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔“

”نہیں میں گرم دل سے سوچوں گا..... میری بات کا جواب دو۔“

”اس طرح اگر میں تمہارے باپ کو آنکھ ماروں تو وہ بھی بُرا نہیں مانیں گے۔“

”میرے باپ کو آنکھ مارو گے۔ ہڈیاں نہ چبا جاؤں گا تمہاری..... یہ مجال۔“

قاسم نے گریبان کو جھٹکا دیا اور حمید کی روح فنا ہو گئی۔

”اچھا ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”دس سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر تم نہ سمجھا سکے تو میں قبر کھود کر دفن کر دوں گا سمجھو!

میرے باپ کو آنکھ ماریں گے، بڑے مارنے والے..... ہاں۔“

”تم کسی عورت کو ماں کہتے ہو۔“

”میری ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔“

”پرواہ مت کرو! میں تو ایک مثال دینے جا رہا تھا تم کسی عورت کو ماں کہو تو وہ خوش ہوگی۔

لیکن اسکو باپ کی جو رو کہہ کر دیکھ لو کیا حشر ہوتا ہے تمہارا۔ حالانکہ باپ کی جو رو ہی ماں ہوتی ہے۔“

”اچھا میں سمجھ گیا..... آگے کہو۔“

”کیا کہوں..... تمہیں دنیا کا کچھ تجربہ ہی نہیں ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے..... کسی چیز کا مطلب نہیں سمجھتے۔“

”ارے تم تو بڑے قابل ہو۔ پھر بتاؤ نا.....!“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

”آنکھ مارنے کے انداز میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک آنکھ اس طرح ماری جاتی ہے کہ لوگ برا مان جاتے ہیں، لیکن اگر تم اپنا ایک گال پھلا کر آنکھ مارو تو کوئی بھی برا نہیں مانے گا۔ آیا سمجھ میں..... تم اس طرح کسی کو آنکھ مار کر دیکھنا۔“

قاسم کا ایک گال غیر ارادی طور پر پھولتا چلا گیا۔ لیکن پھر آنکھ مارنے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی کیونکہ اس طرف کی آنکھ خود بخود بند ہو گئی تھی۔ قاسم چند لمحے کوشش کرتا رہا پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”نہیں بنتا۔“

”اچھا ادھر دیکھو.....!“ حمید نے اپنا ایک گال پھلا کر اُسے آنکھ ماری۔

”تم سے تو بن جاتا ہے۔“ قاسم نے بے بسی سے کہا۔ ”مگر اپنا یہ سالا گال ہی ایسا ہے کہ پھول کر آنکھ پر چڑھ جاتا ہے۔ اچھا اگر دوسری آنکھ ماری جائے تو.....!“

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ حمید نے بڑے خلوص سے کہا۔

قاسم نے پھر ایک طرف کا گال پھلایا اور دوسری طرف کی آنکھ مارنے کی کوشش کی، لیکن وہ آنکھ صرف بند ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ ایک آنکھ تو پہلے ہی بند تھی۔

”کیوں! بنا کر نہیں۔“ قاسم نے حمید سے پوچھا۔

”بننے لگے گا..... تھوڑی مشق کی ضرورت ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

قاسم نے حمید کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور وہیں دھوپ میں کھڑے کھڑے مشق شروع کر دی تھی۔ اب وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ حمید کو یہاں لایا کیوں تھا۔

”ابے نہیں بنتا حمید بھائی۔“ قاسم نے پھر بڑی بے بسی سے کہا۔ اتنے میں وہ تینوں لڑکیاں وہاں آ گئیں۔

”ارے بھائی صاحب۔“ ایک نے قاسم سے کہا۔ ”کیا سعید بابر کے یہاں نہیں چلتا ہے۔“

سائے کی لاش

”ارے وہ خود ہی آجائے گا۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”مگر سعید..... سعید نہیں کلو..... میرے پر نام کلو ہے۔“

”ہائیں کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ لڑکی بولی۔ ”سعید بابر..... بابر نہیں۔“

سعید بابر کے نام ہی پر حمید کو جھرجھری سی آگئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سالا کمل ہی میں چوڑتا۔ بھلا یہاں بھی سعید بابر کے تذکرہ کی کیا ضرورت تھی۔

”اچھا..... اچھا..... وہی جس کا تذکرہ کل کیا تھا۔“ قاسم نے مسکرا کر کہا۔ ”بڑا عجیب نام ہے، سعید بابر بالکل شیر ببر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ گھبری کا بچہ نکلا تو میں اس کی گردن مروڑ دے گا..... ہاں یہ سالے نام بھی بڑا دھوکا دیتے ہیں..... نام پہاڑ خان اور خود چھری اولاد۔“

”قاسم یار..... تم تو ظنی ہوتے جا رہے ہو۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”اور کیا..... ہاں نہیں تو سالے۔“

پھر حمید نے اس لڑکی سے پوچھا۔ ”آپ سعید بابر کو کیسے جانتی ہیں۔ وہ تو شاید افریقہ سے آیا ہے۔“

”میں اُسے افریقہ ہی سے جانتی ہوں۔ نیروبی میں میرے چچا کا بزنس ہے۔ میں بھی وہاں تین سال رہ چکی ہوں..... اوہو..... آپ بھی چلے..... بڑا لطف رہے گا۔ آپ یقیناً اُسے ہند کریں گے۔“

”ہم لوگ کسی کو بھی پسند نہیں کرتے۔“ قاسم نے برا سامنے بتا کر کہا۔ ”کیوں حمید بھائی۔“ حمید نے قاسم کی بات پر دھیان دیئے بغیر کہا۔ ”میں اُس سے ضرور ملوں گا۔ مجھے افریقہ بہت پسند ہے۔ مگر آج تک جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”ارے تمہارے لئے کیا مشکل ہے حمید بھائی۔ کوئی کیس بتاؤ..... بس چلے چلیں گے۔ ہی ہی..... وہاں کی بیلیاں کیسی ہوں گی..... ہی ہی.....“ قاسم بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”بیلیاں کیا چیز۔“ تینوں لڑکیوں نے حیرت ظاہر کی۔

”ارے وہ کچھ نہیں..... جی ہاں تو آپ کب جائیں گی وہاں۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”بس چل رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور لڑکیاں واپس جانے کے لئے مڑیں اور قاسم

”یار حمید بھائی..... بڑی بوریٹ رہے گی۔ کل میں نے یوں ہی وعدہ کر لیا تھا۔ کل اس سارے کی تعریفوں کی پل باندھے جا رہے ہیں۔“

”چلو دیکھتے ہیں..... ڈھب پر آ گیا تو مرغا۔“

”ہااا.....!“ قاسم حمید کے شانے پر ہاتھ مار کر ہنسا اور حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے شانے پر کوئی بڑی سی چٹان آگری ہو۔ وہ دونوں پورچ کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک قاسم دماغ پھر سنک گیا اور چلتے چلتے رک کر غصیل آواز میں بولا۔ ”تم اپنے گھر جاؤ۔“

”کیوں.....؟“

”تم آج کل یہاں روزانہ آ رہے ہو..... میں خوب سمجھتا ہوں۔ نہیں تم اپنے گھر جاؤ۔“

”کیا سمجھتے ہو۔“

”تم ان تینوں کی وجہ سے آتے ہو۔“

”اچھا تو پھر.....!“

”اچھا تو پھر..... یہ کہ چپ چاپ چلے جاؤ۔“

”اچھا..... تو پھر میرا نام حمید ہے سمجھ! تمہارے گلے میں رسی ہوگی اور میں سارے شہر میں ڈگڈگی بجاتا پھروں گا، اچھا میں چل دیا۔“ حمید اپنی کار کی طرف بڑھا۔

اچانک سلیمہ نے برآمدے سے آواز دی۔ ”کیا آپ جا رہے ہیں۔ آپ نے تو سامنے چلنے کو کہا تھا۔“

”انہیں جانے دو۔“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”ان کے..... ان کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“

حمید کار میں بیٹھ چکا تھا، لیکن اشارت بھی نہیں کر پایا تھا کہ سلیمہ اس کے قریب پہنچ گئی۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”قاسم بھگا رہا ہے۔“

”کیوں.....؟“

”اسکا خیال ہے کہ میں صرف آپکی وجہ سے یہاں آتا ہوں۔“ حمید گلوگیر آواز میں بولا۔

”ان کا بھی دماغ خراب ہے شاید..... آپ چلے..... میں بھی چل رہی ہوں۔“ سلیمہ بازو کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

حمید نے کار اشارت کردی اور قاسم۔ ”ہائیں ہائیں۔“ کرتا ہوا دوڑا لیکن کار پھانک سے نذر چکی تھی۔ قاسم پلٹ کر اپنے گیراج کی طرف لڑھکنے لگا۔

دوسرے پر فائر

تویر کبھی تنہا باہر نہیں نکلتی تھی۔ اس کے ساتھ ہمیشہ دو باڈی گارڈ ہوتے تھے اور دونوں اپنے پاس بھرے ہوئے ریوالور رکھتے تھے اور اب کچھ دنوں سے وہ عدنان کو بھی تنہا باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔ دو باڈی گارڈ اس کے ساتھ بھی رہا کرتے تھے۔

یہ چاروں آدمی بظاہر سیدھے سادے اور بے ضرر تھے، لیکن ان کی حقیقت صرف تویر کو معلوم تھی۔ یہ چاروں اول درجے کے بد معاش، سازشی اور قاتل تھے۔ ویسے یہ تویر سے بہت ڈرتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر اس طرح آگے بڑھتے تھے جیسے پالتو کتے ہوں۔

اس وقت وہ تویر محل کے ایک کمرے میں بیٹھے شاید تویر ہی کے خطر تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے اور فکر مند نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد تویر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ تویر نے سر کی جنبش سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مودب بیٹھ گئے۔

”تم لوگوں کو شکایت تھی کہ میں تم سے کبھی کام نہیں لیتی۔“ تویر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”مگر اب کام کا وقت آ گیا ہے۔“

وہ بڑی توجہ سے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ تویر نے اخبار میز پر پھیلا دیا اور اخبار میں جھپی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس آدمی کو جہاں دیکھو گولی مار دو۔“

وہ باری باری سے اس تصویر کو دیکھنے لگے۔ پھر ایک نے پوچھا۔ ”یہ رہتا کہاں ہے۔“
 ”تلاش کرو۔“ تصویر نے کہا۔ ”اخبار میں اُس کا پتہ نہیں ہے۔“
 ”ہم جلد سے جلد اسے پھانسی کی کوشش کریں گے۔“

”بس اتنا ہی کہنا تھا۔“ تصویر اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک وہ باہر نہیں چلی گئی۔

پھر وہ بیٹھ کر ایک دوسرے کی طرف متنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ آخر ان میں سے ایک نے کہا۔

”محترمہ تصویر بڑے دل گردے کی عورت ہیں۔ انہوں نے اس طرح اس قتل کا حکم صادر فرمایا ہے جیسے ہمیں سعید بابر کے سر میں تل مائل کرنی ہے۔“

”کیا اس کے متعلق اخبار میں کوئی خبر بھی ہے۔“ دوسرے نے پوچھا۔

”ہاں ہے تو۔“ پہلے نے اخبار پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ نیروبی سے آیا ہے، وہاں کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ اس میں یہ تحریر ہے کہ وہ اپنے اعزہ سے ملنے کے لئے یہاں آیا ہے۔“

”اور مادام تصویر چاہتی ہیں کہ ہم اُسے گولی مار دیں۔“ تیسرا بولا۔

”ہمیں اس سے غرض نہ ہونی چاہئے۔“ چوتھے نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”حکم۔ حکم ہے۔“

”ہم کب کہہ رہے ہیں کہ حکم نہ مانیں گے۔“

اچانک عدنان کمرے میں داخل ہوا اور وہ پھر کھڑے ہو گئے۔ عدنان نے مسکراتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آج کل تم لوگ بیکار ہو۔“ عدنان بیٹھتا ہوا بولا۔

”نہیں! ہم مادام کا ضروری کام کر رہے ہیں۔“

”کون سا کام۔“

”اوہ..... جناب آپ کے زخم کا کیا حال ہے۔“ ایک نے دفعتاً پوچھا۔

”تم بڑے گدھے ہو..... جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں، اُس کا جواب دو۔“

”جناب عالی..... آپ خود خیال فرمائیں..... ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔“

”کیا! تمہیں بتانا پڑے گا۔“

”بہتر یہ ہوگا کہ آپ ہمیں شوٹ کر دیں ورنہ مادام کا غصہ ہمارے لئے موت سے بھی

زائد ہمایاں ہوگا۔“

”میری کوئی وقعت نہیں ہے..... کیوں؟“ عدنان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”نہیں جناب..... ہم آپ کے لئے بھی جان دینے کو حاضر ہیں۔“

عدنان کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”اچھا میرے لئے بھی ایک کام کرو۔“

”فرمائیے..... جناب۔“

”مجھے وہ کتا چاہئے جس نے شکار گاہ میں مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

”کتا.....!“ چاروں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں..... وہ کتا ہی تھا۔ سیاہ رنگ کا اونچا سا کتا..... جسم کے ساخت گرے ہاؤنڈ کی سی تھی

اور شاندار سر پر سفید دھاریاں بھی تھیں۔“

”ہم اُسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے جناب۔ مگر کیا وہ بہت خطرناک ہے۔“

”شاید خطرناک ہی ہے۔“

”آپ اُس کی لاش چاہتے ہیں۔“

”نہیں زندہ..... لاش کیا کروں گا۔“

”ہم انتہائی کوشش کریں گے۔“

عدنان بھی اٹھ کر چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک خاموشی رہی پھر ایک

نے آہستہ سے کہا۔

”دونوں ہی عجیب ہیں..... ہم کتنے دنوں سے یہاں ہیں، لیکن ہمیں آج تک مادام کے

متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

”مگر اس آدمی سعید بابر کو ہم کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔ بڑا ٹیڑھا کام ہے۔“

”کچھ بھی ہو..... ہمیں یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔“ اس معمر آدمی نے کہا جو کم بولتا تھا اور بقیہ

تینوں اس کا احترام بھی کرتے تھے۔

سے کھلتے اور چمکدار دانتوں کی قطار جھانکنے لگتی۔ آنکھوں میں شوخی عود کر آتی اور اس کا ہم قدر کتا سامحوس ہونے لگا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ایوگ ان پیرس کی لپٹیں اس کے س سے نکل رہی ہوں۔

”مگر ہم کہاں چل رہے ہیں۔“ سلیمہ نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔
”ہم کیوں نہ افق کے پار چلیں۔“

”آہا..... آہا..... تو اب آپ مجھ سے رومانی قسم کی گفتگو کریں گے۔ اچھا چلئے میں شرما کر اب کیا کہیں گے آپ۔“

”اب میں یہ کہوں گا کہ دنیا کے ہر آدمی کو فرشتوں کی طرح زندگی بسر کرنی چاہئے۔“

”میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکی ہوں۔“

”اور اب مجھ میں یہ جملہ سننے کی تاب نہیں رہ گئی۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”شہر کی جس نئی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے وہ میرا نام معلوم ہو جانے کے بعد یہی کہتی

ہے آخر آپ میرے متعلق کیا سن چکی ہیں۔“

”کچھ نہیں..... کوئی اور بات کیجئے۔“

”آپ ہی چھیڑیئے کوئی بات۔“

”نہیں آپ تو باتوں کے ماہر ہیں۔“

”خیر میں ہی شروع کرتا ہوں..... سعید باہر سے آپ پہلے بھی!۔“

”نو..... نو..... پلیز..... سعید باہر کی باتیں سننے سننے کان پک گئے ہیں۔ پتہ نہیں راحلہ کو

ا میں کون سی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ نہیں سعید باہر کے علاوہ اور کوئی بات۔“

”سراغ رسانی سے دلچسپی ہے آپ کو۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہت زیادہ..... حد سے زیادہ..... میرے لئے آپ میں صرف یہی ایک کشش ہے۔“

”ویسے میں بالکل اُلو کا پٹھا ہوں..... کیوں؟“

”نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ کچھ اور نہ سمجھئے گا۔“

”اور کیا سمجھوں گا۔“

”وہ تو ہے..... لیکن اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو۔“

”بس یونہی خیال ہے..... ناکامی کی صورت میں ہمارا کیا حشر ہوگا۔“

”ناکامی کی بات ہی نہ سوچو۔ میں اسے شائع عام پر گولی مار سکتا ہوں۔“ معمر آدمی نے کہا۔

”سوچ سمجھ کر دعویٰ کرو..... آج کل یہ سب کچھ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ جب سے سادہ

لباس والوں کا چارج کرئل فریدی نے لیا ہے، بہت کم جرائم ہو پاتے ہیں۔“



حمید کی کارفرمائے بھر رہی تھی اور سلیمہ پہلے پہل تنہا اس کے ساتھ باہر نکلتی تھی۔ اُن تینوں میں یہی تھی سب سے زیادہ زندہ دل۔ ایسی کہ حمید اس کی ہم نشینی میں بوریت نہیں محسوس کر سکتا تھا۔

”آخر آپ دونوں کے تعلقات کیسے ہیں۔“ سلیمہ نے پوچھا۔

”بہت ہی دلچسپ۔“ حمید بولا۔ ”وہ خود ہی تعلقات قائم کرتا ہے، اور بگاڑ بیٹھتا ہے۔“

”مگر بیگم صاحبہ تو کہتی ہیں کہ آپ ہی نے انہیں بگاڑ رکھا ہے۔“

”غلط کہتی ہیں۔ میں نے اُسے بگاڑا نہیں بلکہ ہاتھی بنایا ہے۔“

سلیمہ پہلے تو ہنسی پھر آہستہ سے مغموم لہجے میں بولی۔ ”دونوں کی زندگی برباد ہو گئی ہے۔

میں تو لعنت بھیجتی ہوں ایسی شادی پر۔“

”مگر مجھے بے جوڑ شادیاں بہت پسند ہیں۔ اگر بیوی یا شوہر پسند کامل جائے تو زندگی

محدود ہو جاتی ہے۔ آدمی مطمئن ہو جاتا ہے۔ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کی زندگی میں بس یہی ایک کی

رہ گئی تھی، جو پوری ہو گئی۔ اب اُسے کچھ نہیں کرنا ہے۔“

”واہ.....! یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”قاسم ہی کی مثال لے لیجئے۔ اگر بیوی پسند کی ملی ہوتی تو وہ اپنے پیٹ پر پتھر نہ تڑواتا،

منہ سے لوہے کے گولے نہ نکالتا..... موٹی موٹی سلاخیں نہ موڑتا۔“

سلیمہ پھر ہنسنے لگی۔ اُس کے ہنسنے کا انداز حمید کو بہت پسند تھا۔ بھرے بھرے سے ہونٹ

”اوہ..... آپ اپنی بات کیجئے۔ ہاں مجھے سراغِ رسانی سے بہت دلچسپی ہے۔“

”اچھا تو اگر آپ کسی مظلوم فقیر کو بیمار جانوروں کی طرح رینگ رینگ کر بیگ مارنے دیکھتیں پھر اچانک ایک دن آپ اس کی لاش بھی دیکھ لیتیں..... اور کچھ ہی دنوں کے بعد ایک سید باہر آپ کے سامنے آ جاتا..... تو.....!“

”کیا بات ہوئی۔ میں خاک بھی نہیں سمجھی۔“

”کچھ دنوں بعد سید باہر اس طرح آپ کے سامنے آیا کہ اُس مظلوم مردہ فقیر اور سید باہر میں سر مو فرق نہیں تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”دونوں کی شکلیں ایک تھیں۔“

”نہیں.....!“

”یہ حقیقت ہے..... میں سینکڑوں آدمیوں کی شہادت دلواسکتا ہوں۔“

”اوہ..... جب میں یقیناً اُس کا تذکرہ سنا پسند کروں گی۔“

”کیا آپ کی عدم موجودگی میں وہ لوگ سید باہر کے یہاں جائیں گے۔“

”پہلے سے وقت مقرر کئے بغیر وہ کسی نے نہیں ملتا۔“

”اُس کا باپ بھی ملے گا۔“

”کیسے.....!“

”اوہ..... کیپٹن حمید آف انٹیلی جنس بیورو سے ملنے سے کون انکار کرے گا۔“

”واہ..... یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔“

”کچھ نہیں بس ایک نظر دیکھوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی تصویر اس سے مختلف ہو۔“

ایسا بھی ہوتا ہے مگر کیا آپ کو اس کا پتہ معلوم ہے۔“

”پتہ..... وہاں شاید وہ کنکس لین کی کسی عمارت میں مقیم ہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کنکس لین میں اُسے کہاں تلاش کریں گے۔“

”آپ تو سراغِ رساں ہیں۔“

”چلیے!“ حمید ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”یہ بھی سہی۔“

اُسے اطمینان تھا کہ وہ کار میں بیٹھے ہی بیٹھے اس کی قیام گاہ کا پتہ لگا لے گا۔ وجہ یہ تھی کہ آج کل سادہ لباس والوں کا انچارج فریدی تھا اور اس نے انہیں کچھ اس انداز میں پھیلایا تھا کہ شہر کے ہر حصے میں دو ایک سادہ لباس والے ہر وقت موجود ملتے تھے۔

حمید نے کار کنکس لین کے موڑ پر روک دی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک سادہ لباس والا موجود تھا۔ حمید نے اُسے اشارے سے بلایا۔ وہ بڑی تیزی سے کار کے قریب آیا۔

”ہیں سر.....!“

”پتہ لگاؤ کہ سید باہر کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ افریقہ سے آیا ہے۔“

”سولہ نمبر کی کوشی میں جناب..... وہ موجود ہے۔ ایک انگریز بیکریٹری اور تین ملازم ایک

چھوٹی سی بڑے بالوں والی کتیا بھی ہے۔“

”بہت خوب! تم لوگ بہت تندی سے کام کر رہے ہو۔“

”ہیں سر.....!“

”اب تم جا سکتے ہو۔“

وہ سلام کر کے چلا گیا۔

”یہ سب کتنا سنسنی خیز ہے۔ میرے خدا.....!“ سلیمہ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

”ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔“ حمید نے کہا اور کار کنکس لین کے اندر موڑ دی۔

یہاں دونوں طرف بڑی شاندار عمارتیں تھیں۔ ان کی کار سولہ نمبر کی کوشی کے سامنے رک

گئی۔ حمید کار کو کمپاؤنڈ کے اندر نہیں لے گیا۔ وہ دونوں اتر کر چھانک میں داخل ہوئے اور

برآمدے میں ایک صاف ستھرے ملازم نے ان کا استقبال کیا۔ حمید نے اُسے اپنا کارڈ دے کر

کہا۔ ”ضروری کام ہے۔“

”صاحب تو سو رہے ہیں..... میں مس صاحب کو اطلاع کئے دیتا ہوں۔“

”صاحب سے کام ہے..... خیر..... مس صاحب ہی سہی۔“

”آپ یہاں تشریف رکھئے۔“ اُس نے نشست کے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔

وہ اس کمرے میں آئے۔ سلیمہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

”آپ مس صاحب سے مل کر کیا کریں گے۔“

”یہ تو اُس سے ملنے کے بعد ہی سوچوں گا کہ کیا کرنا چاہئے۔“

سلیمہ خاموش ہو گئی۔ مگر شاید اُسے اس طرح انتظار میں بیٹھنا گراں گذر رہا تھا۔ حمید بھی خاموش تھا۔ اچانک قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سچے خواب دیکھ رہا ہو۔ کیونکہ دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی اور اُس مفلوج فقیر میں اگر کوئی فرق تھا تو یہی تھا کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا اور وہ بیچارے پیروں سے معذور ہونے کی بناء پر کمشتا پھرتا تھا۔

• حمید فوراً ہی سنبھل گیا۔ اُس نے اپنے چہرے سے استعجاب نہیں ظاہر ہونے دیا۔

سعید بابر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے آگے بڑھا۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ آپ تشریف لائے۔ میرے لائق کوئی خدمت۔“ اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ایک ضمنی سی کاروائی ہے۔ مجھے اکثر باہر سے آئے ہوئے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنی پڑتی ہے۔ میں صرف آپ کے پاسپورٹ پر ایک نظر ڈالوں گا۔“

اچانک حمید کو قاسم کا قہقہہ سنائی دیا اور حمید کی روح فنا ہو گئی۔ دوسری طرف سعید بابر شاید نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی کا بٹن دبا رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں راحلہ، نجمہ اور قاسم کمرے میں داخل ہوئے۔

”ہائیں تم یہاں.....!“ قاسم بھاڑ سامنے کھول کر رہ گیا۔

”ہاں..... میں یہاں ایک سرکاری کام سے آیا ہوں۔“ حمید نے جواب دیا۔

”اوہ آپ مس راحلہ.....!“ سعید بابر راحلہ کی طرف بڑھا۔

نجمہ سلیمہ سے بولی۔ ”یہ کیا حرکت تھی۔“ بہر حال کمرے میں عجیب سی افراتفری مچ گئی۔ ہر

ایک بوکھلایا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ شاید ایک منٹ بعد حالات اعتدال پر آئے۔

حمید راحلہ سے کہہ رہا تھا ”آپ کے پاس سے میں یہیں آتا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ بھی یہیں آنے والی ہیں تو میں نے کہا کہ پہلے ہی اپنا کام ختم کرنا چلوں۔ مگر محترمہ سلیمہ زبردستی میرے ساتھ چلی آئیں۔“

قاسم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور بند کر لیا۔

”اوہ.....! یہ میری مزید خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے دوستوں کے دوست ہیں۔“

سعید بابر نے دوبارہ حمید سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

اُس کا طلب کردہ نوکر آ گیا تھا۔ اُس نے اس سے کہا۔ ”مس براؤن کو بھیج دو۔“

قاسم منہ چلانے لگا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ نظر آئی اور اس نے دوسروں کی نظر بچا کر حمید کو آنکھ ماردی۔

”ہم تین سال بعد ملے ہیں محترمہ راحلہ۔“ سعید بابر نے راحلہ سے کہا۔ ”آپ یہاں کب سے مقیم ہیں۔“

”ہم ابھی حال ہی میں آئے ہیں۔“

”بڑی اچھی ملاقات رہی۔ خصوصاً آپ سے۔“ اُس نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں بڑی شدت سے ایک ہمدرد آفیسر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اور اب تو آپ آفیسر ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہیں۔ میرے دوستوں کے دوست! یعنی میرے بھی۔“

”میرے لائق کوئی خدمت.....“

”اگر اس نشست کے بعد آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکیں تو شکر گزار ہوں گا۔“

”بات کوئی ایسی پوشیدہ بھی نہیں مگر دوسروں کے بور ہونے کا اندیشہ ہے۔“

”نہیں آپ ہر قسم کی گفتگو چھیڑ سکتے ہیں۔“ راحلہ نے کہا۔ ”بور ہونے کا سوال ہی نہیں

پیدا ہوتا۔“

اتنے میں نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ مس براؤن موجود نہیں ہیں۔

”اوہ! وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ سعید نے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... وہ اندر نہ ہوگی۔“

دہلی ایسی اہم بات بھی نہیں تھی۔ بہر حال ایک رات وہ ہم لوگوں کیلئے ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا۔“
قاسم نے بھاڑ سا منہ پھیلا کر آواز کے ساتھ جمائی لی اور منہ چلاتا ہوا ایک ایک کی
دور دیکھنے لگا۔ پھر اس طرح چلکیں چھپکائیں جیسے سوتے سوتے اٹھا ہو۔

”پھر اچانک مجھے اس کا ایک خط ملا، جو بیہوش سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ یہ پانچ سال پہلے کی
بات ہے۔ اس نے اپنی خستہ حالی کی داستان لکھی تھی۔ میں نے اُسے لکھا کہ وہ نیرو دلی واپس
آجائے لیکن اس نے وہاں آنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے مجھے لکھا کہ وہ زیادہ کا مطالبہ نہیں کرتا
اُسے صرف اتنا ہی دیتا رہوں جس سے وہ با فراغت ہر اوقات کر سکے۔ میں اُسے تین ہزار
روپے ماہوار الائیڈ بینک کی معرفت بھیجے لگا۔ اس سے خط و کتابت بھی برابر رہتی تھی۔ ابھی پچھلے
ماہ بھی اس نے الائیڈ بینک سے تین ہزار روپے وصول کئے تھے۔ اتفاقاً میرا یہاں آنے کا
پرگرام بن گیا۔ میں نے اُسے بھی اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب جو میں اس کی قیام گاہ
پر جاتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس نام کا کوئی آدمی کبھی تھا ہی نہیں۔ اُس عمارت میں
ایک بیوہ مسز خان تقریباً پچیس سال سے رہتی ہے۔ میں نے پڑوسیوں سے بھی اس کی تصدیق
کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ رشید بابر نامی کسی آدمی کو نہیں جانتے۔“
”کیا آپ کے بھائی آپ کے ہم شکل تھے۔“ حمید نے پوچھا۔

”جی ہاں..... ہم میں بہت زیادہ مشابہت تھی..... خیر..... اب اپنے ہم شکل ایک فقیر کی
کہانی سن رہا ہوں۔ میں بڑی الجھن میں ہوں کپتان صاحب۔ اگر رشید وہ رقم وصول کرتا رہا تو
اُسے بیگ مافتنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اُسے رقومات نہیں ملیں تو پھر انہیں کون وصول کرتا رہا۔
اگر وہ فقیر میرا ہم شکل تھا تو وہ رشید کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”وہ یقیناً آپ کا ہم شکل تھا۔“ حمید نے ایک طویل سانس لی۔

”کیا آپ نے اُسے دیکھا تھا۔“ سعید نے بیساختہ پوچھا۔

”جی ہاں..... میں عرصہ تک آپ کے ہم شکل ایک فقیر کو دیکھتا رہا ہوں۔“

”اب مجھے یقین آ گیا۔“ سعید نے آہستہ سے غمگین آواز میں کہا اور بیجان سا ہو کر سوئے

کی پشت پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی چٹنی چٹنی سی آنکھوں میں دیرانی تھی۔ پھر اُس نے تھوڑی دیر بعد

پھر اُس نے اُن لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آپ سب اپنے ہی ہیں۔ میں یہاں آ کر
ایک بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا ہوں۔“

سب لوگ خاموشی سے اس کے دوسرے جملے کے خطر رہے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ داستان کہاں سے شروع کروں۔“ اُس نے حمید کی
طرف دیکھ کر کہا۔ ”ویسے میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہاں میری شکل و شبہات کا کوئی
فقیر بھی آپ کی نظر دے گا۔“

”ارے ہی ہی۔“ قاسم ہنسا۔ ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔“

سلیم نے حمید کی طرف دیکھا اور حمید نے اپنی بانیں آنکھ دبا دی۔

”آپ نے نہیں دیکھا۔“ سعید نے مایوسی سے کہا۔ ”خیر..... لیکن ایسا سننے میں آ رہا ہے اور

میں بہت پریشان ہوں۔“

”کیا سننے میں آ رہا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ایسے ہی ایک فقیر کے متعلق..... خیر مشابہت ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا
ہے اور محض مشابہت کی بناء پر میں پریشان نہیں ہو سکتا..... مگر.....!“

حمید کو الجھن ہونے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ جائے۔ مگر وہ
رک رک کر بول رہا تھا۔ سب لوگ بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ صرف قاسم ایسا تھا جو بار بار پہلو
بدلتا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بڑی طرح اکتا گیا ہو۔

”خیر میں یہ بات وہیں سے شروع کرتا ہوں۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ میرا ایک سوتلا
بھائی تھا۔ تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں وہ نیرو دلی سے نکل بھاگا۔ بچپن ہی سے اُس کی حالت عجیب
تھی۔ وہ رات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ لیکن والد مرحوم اُس سے سختی کا برتاؤ کبھی نہ کرتے۔
میں کہتا ہوں کہ اُسے اُن کے بے جالاؤ ہی نے بگاڑا تھا۔ اُس کی ماں یعنی میری سوتیلی والدہ اس
کے بچپن ہی میں مر گئی تھیں۔ محترمہ راجلہ آپ کو تو ان حالات کا علم ہوگا۔“

”نہیں میں نہیں جانتی۔“

”خیر آپ نہ جانتی ہوں گی۔ بہت پرانی بات ہوئی۔ شاید نیرو دلی والوں کو بھی یاد نہ ہو اور پھر

فائر اور لڑکی

حمید نے کمپاؤنڈ کا چپہ چپہ چھان مارا، لیکن اُسے ایک بھی ایسا آدمی نہیں مل سکا جسے وہ فائر کرنے کے الزام میں جکڑ لیتا۔ پھر اُس نے عمارت کے اندر بھی چھان بین شروع کی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ سعید باہر بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ یہ فائر میرے ہی لئے رہا ہو۔“ اس نے کہا۔

”آپ کے لئے کیوں؟“

”جو میرے بھائی کی موت کا باعث بنا ہے، وہ میری زندگی کا خواہاں بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے رشید کے نام پر ایک لاکھ اسی ہزار روپے وصول کئے۔ اب جب کہ میں یہاں آ گیا ہوں، لازمی بات ہے کہ ان واقعات کی رپورٹ پولیس کو دوں گا۔ لہذا قبل اس کے کہ میں ان کے خلاف کوئی کارروائی کروں، وہ مجھے بھی ختم کر دیتا چاہتا ہے۔“

”نائیں..... نائیں۔“ قاسم حمید کی طرف ہاتھ اٹھا کر دھاڑا۔ ”یہ بڑا منحوس آدمی ہے۔ جہاں اس کے قدم جاتے ہیں، شائیں ٹھائیں شروع ہو جاتی ہے۔“

”نہیں جناب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ پکتان صاحب یہاں اس وقت تشریف رکھتے تھے، ورنہ غیر ملکیوں کی شکایات پر کون کان دھرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”بڑی خوش قسمتی۔“ قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ”ذرا بلاؤ..... وہ کون ہے مں بلیک..... اُسے بلاؤ پھر دیکھوں خوش قسمتی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ سعید باہر نے کہا۔

”قاسم بھائی..... کیا بکواس لگا رہی ہے آپ نے۔“ راحلہ نے اُسے ڈانٹا اور قاسم بُرا سا منہ بنائے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

سعید باہر حیرت سے ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ راحلہ نے اپنی داہنی کینٹی کے

کہا۔ ”میرے خدا..... یہ کیا اندھیر ہے کہ وہ بھیگ مانتا پھر رہا ہے اور کسی نے پچھلے ماہ بھی اس کے نام سے تین ہزار روپے وصول کئے ہیں۔ میں نے الائیڈ بینک میں اچھی طرح تحقیق کی ہے۔ اس کا حساب بھی وہاں چلتا تھا۔ آخری رقم جو اس نے وہاں سے نکالی ہے وہ پچاس ہزار تھی اور تین ہزار تو ہر ماہ وصول کرتا رہتا تھا۔“

”وہ رقم کس تاریخ کو نکالی گئی تھی؟“ حمید نے پوچھا۔

”میرے یہاں پہنچنے سے تین دن پہلے یعنی..... سات جنوری کو۔“

”سات جنوری.....!“ حمید بے ساختہ چونک پڑا۔

”جی ہاں..... اسی تاریخ کو اُس نے پچاس ہزار روپے بینک سے نکالے تھے اور یہ آخری بڑی رقم تھی۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں صرف سات روپے پڑے ہوئے ہیں۔“

”سات روپے..... سات جنوری۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”اور یہی سات جنوری اُس کی موت کی بھی تاریخ ہے۔“

”موت.....!“ سعید باہر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”کسی نہ کسی سے تو آپ کو اس کی اطلاع ملنی ہی تھی۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”جی ہاں..... سات جنوری کو اس کی لاش صدر کے ایک فٹ پاتھ پر دیکھی گئی تھی۔“

وہ دہم سے صوفے میں گر گیا اور تینوں لڑکیاں اس کے گرد اکٹھا ہو گئیں۔ وہ بیہوش نہیں ہوا تھا، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن پلکیں یا پتلیاں متحرک نہیں تھیں۔

اچانک ایک فائر ہوا اور گولی راحلہ کے سر پر سے گذرتی ہوئی سانے کی دیوار سے لگی۔ کھڑکی کے شیشے میں ایک ناہموار سا سوراخ تھا۔ راحلہ تو دھڑام سے فرش پر آ رہی اور دوسرے لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ حمید اچھل کر برآمدے میں آ رہا۔ اُس نے اس کھڑکی کی طرف دیکھا جس سے گذر کر گولی اندر پہنچی تھی اور پھر اس کے سیدھ میں دوڑنے لگا، لیکن اس کے سانے والی مہندی کی باڑھ کے پیچھے اُسے کوئی بھی نہیں دکھائی دیا۔ سعید کے تینوں نوکر شاید فائر کی آوازیں کر رہی باہر آئے تھے۔

قریب انگلی لے جا کر اُسے چکریا۔ مطلب یہ تھا کہ قاسم کا اسکر یوڈھیلا ہے۔

”اوہ..... اچھا!“ سعید باہر پھر حمید سے مخاطب ہو گیا۔ ”ہاں تو..... جناب اب میری زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے، لیکن میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک کہ اُس مردود کا پتہ نہ لگ جائے جس کی بدولت میرا بھائی ایڑیاں رگڑ کر مر گیا۔“

”قدرتی بات ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔

اچانک ایک نوکر دوڑتا ہوا کمرے میں آیا۔ اُس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور چہرہ سرخ تھا۔ ”مس صاحب.....!“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”گودام میں..... بورے میں!“

”کیا بات ہے۔“ سعید باہر اُسے گھورنے لگا۔

”مس صاحب..... گودام میں بیہوش.....!“

”ارے.....!“ وہ دروازے کی طرف جھپٹتا ہوا بولا۔ ”کپتان صاحب۔“

”آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔“ حمید نے دوسروں سے کہا اور اس کے پیچھے چلا گیا۔ ابھی دروازے سے باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ قاسم بڑبڑایا۔ ”کھالینا..... مس ساب کو..... ہاں۔“

راحدہ اُس پر برس پڑی۔

سعید باہر بڑی تیزی سے راہداری طے کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک کمرے کے سامنے رکے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ حمید نے محسوس کیا کہ سعید باہر اندر جاتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ وہ شاید اُس نوکر کا شہر تھا جس نے اُسے اطلاع دی تھی۔

”کہاں مر گئے تھے۔“ وہ اچانک نوکر پر برس پڑا جو لنگڑاتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

شاید اس بھاگ دوڑ میں اس کے پیر میں چوٹ آ گئی تھی۔

”اندر جناب..... وہ اُھر.....!“

”چلو.....“ سعید باہر نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ نوکر کے پیچھے ہی پیچھے وہ دونوں

بھی اندر داخل ہوئے۔

حمید کو سامنے ہی دو ٹانگیں نظر آئیں جن پر کشمی رنگ کے اسٹانگ تھے اور ٹاپ ہیل

جوئے..... آدھا دھڑ ایک بورے میں تھا۔

سعید باہر کے ہاتھ پیر بڑی طرح کاپنے لگے تھے۔ آنکھیں

بہت سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ کسی اعصاب زدہ آدمی کی طرح مضبوط الحواس نظر آ رہا تھا۔

”یہ..... یہ کپتان صاحب..... میری سیکریٹری..... مس براؤن۔“

”تو پھر نکالے نا..... پتہ نہیں یہ لاش ہے یا.....!“

”لاش.....!“ سعید باہر کے حلق سے چیخ سی نکلی اور لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا لگا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ حمید جھنجھلا گیا اور خود ہی سے اُسے بورے سے نکالنے کی ہوش کرنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک بڑی خوبصورت انگریز لڑکی فرش پر چت پڑی ہوئی تھی۔ وہ مردہ نہیں تھی۔ صرف بیہوش تھی۔ مگر اب سعید باہر خوفزدہ نہیں تھا۔ البتہ اُس کے چہرے

ہجرت کے آثار ضرور تھے اور اس کا ملازم بھی متحیر ہی نظر آ رہا تھا۔

”کیا یہ یہیں پڑی رہے گی۔“ حمید نے کہا۔

”جی.....!“ سعید بیساختہ چونک پڑا۔ ”جی ہاں..... جی نہیں۔“

”مسٹر سعید۔“ حمید بولا۔ ”مجھے بڑی حیرت ہے۔ اُس فائر نے آپ کو اتنا زیادہ پریشان

نہیں کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ سعید بڑبڑایا۔ ”یہ واقعہ اُس فائر سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔“

”نہیں میرے خیال سے یہ بھی اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ممکن ہے اس نے فائر

کرنے والے کو دیکھ لیا ہو۔ یعنی فائر کرنے سے قبل! اور وہ اپنی اسکیم کو ناکام ہوتے دیکھ کر یہ

حرکت کر بیٹھا ہو۔“

”مگر..... میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“

”کیا مطلب.....!“ حمید چونک کر اُسے گھورتا ہوا بولا۔ ”کیا مس براؤن نہیں ہے۔“

”نہیں..... یہ مس براؤن نہیں ہے۔“ سعید نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

حمید نے نوکر کی طرف دیکھا اور نوکر بھی سر ہلا کر بولا۔ ”یہ اپنی مس ساب نہیں ہیں۔“

”آپ اسے پہچانتے بھی نہیں۔“

”نہیں جناب..... مجھے حیرت ہے۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“

”مس براؤن کہاں ہے۔“

”وہ دو گھنٹے کے لئے باہر گئی ہے۔“

”مگر آپ کے ملازم نے تو کہا تھا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ میں مس صاحب کو خبر کرتا ہوں۔“

”میری جگہ اگر آپ بھی ہوتے تو یہی کرتے۔“

”یعنی!۔“

”آپ خود سوچئے پکتان صاحب، ایسے آدمی کی حالت کیا ہوگی جس کا کوئی ہم شکل فقیر بھی موجود ہو۔ تصویر شائع ہوتے ہی پریس رپورٹروں کا تار بندھ گیا۔ سینکڑوں آدمی بھی دیکھنے کیلئے آئے۔ میرے خدا..... میں حیلہ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ لسلٹی براؤن لوگوں سے گفتگو کرتے کرتے تنگ آ گئی اور اسے بھی ٹل جانا پڑا۔ ملازم کو شائد علم نہیں تھا کہ وہ باہر چلی گئی ہے۔“

”اوہ..... اچھا! مگر یہ واقعی بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ گولی باہر سے چلائی گئی تھی۔ اگر اس لڑکی نے حملہ آور کو دیکھ لیا تھا تو حملہ آور نے اسے بیہوش کر کے یہاں اندر لانے کا خطرہ کیوں مول لیا۔ وہ اُسے کمپاؤنڈ ہی میں کہیں بیہوش کر کے ڈال سکتا تھا۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں پکتان صاحب۔ آخر اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں یقیناً کسی بہت بڑی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔“

چند لمحہ خاموش رہ کر پھر حمید نے کہا۔ ”کیا یہ یہیں پڑی رہے گی۔“

”جو کچھ آپ فرمائیں کیا جائے۔“ سعید نے جواب دیا۔

”اُسے کسی ہوادار کمرے میں لے چلنا چاہئے۔“

”نہیں!“ سعید بولا..... ”بیرونی برآمدے میں..... نہ جانے یہ ہوش میں آ کر کون سا فائدہ

کھڑا کرے۔ نہیں پکتان مجھے بہت محتاط رہنا چاہئے۔“

”ہوں.....!“ حمید نے سر ہلا دیا۔ ویسے وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے اُس کو اٹھانے میں پہل نہ کرنی چاہئے۔ سعید بابر حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اُسے اٹھائیے۔“ حمید نے کہا۔

”میں کیوں اٹھاؤں۔“ سعید بابر جھنجھلائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

حمید نے نوکر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کانپتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ پھر حمید نے بیہوش لڑکی کو اٹھایا اور بیرونی برآمدے کی طرف جانے والی راہداری طے کرنے لگا۔ سعید بابر اس کے پیچھے چلے رہا تھا۔

قاسم کی نظر اس جلوس پر پہلے پڑی اور وہ بیساختہ چنگھاڑا۔ ”دیکھا..... میں نہ کہتا تھا..... ہا۔“

”چلو..... ایک صوفہ اٹھا لاؤ اندر سے.....!“

”اچھا..... اچھا.....!“

قاسم نے ڈرائنگ روم کا ایک صوفہ اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو۔ صوفہ برآمدے میں ڈال دیا گیا اور بیہوش لڑکی اس پر ڈال دی گئی۔ قاسم منہ کھولے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ کبھی وہ حمید کی طرف دیکھتا اور کبھی بیہوش لڑکی کی طرف۔ تینوں لڑکیاں بھی وہیں پہنچ گئی تھیں۔ تقریباً پندرہ یا بیس منٹ تک وہ مختلف تدبیریں عمل میں لاتے رہے لیکن اُسے ہوش نہیں آیا، مگر اس دوران میں نہ تو سعید ہی نے کسی ڈاکٹر کو بلانے کی تجویز پیش کی اور نہ ہی حمید نے اس کے متعلق سوچا۔

پورے آدھ گھنٹے کے بعد لڑکی کسمائی۔ پوٹوں میں متواتر جنبش ہونے لگیں اور پھر اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی، لیکن سلیہ اگر جلدی سے آگے بڑھ کر ہاتھ نہ لگا دیتی تو وہ صوفے کے نیچے چلی آئی ہوتی۔ سلیہ کا ہاتھ لگتے ہی وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی پھر ہڈیانی انداز میں چیخی۔

”میں یہاں نہیں رہوں گی..... میں اس ملک میں نہیں رہوں گی۔“

”وہ سب خاموش رہے۔“

”مسٹر بابر میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ پھر اُسی انداز میں چیخی۔ ”میں واپس جاؤں گی۔“

”آپ مجھے کیا جانیں..... آپ کون ہیں۔“ بابر نے پوچھا۔

”کیا.....؟“ لڑکی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کون ہیں! یہاں کیسے آئیں۔“ بابر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ لڑکی نے بُرا سا منہ بنا کر تلخ لہجے میں کہا۔ ”میرا

”تب تو پھر وہ نشے میں ہیں یا انکا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آپ ان نوکروں سے پوچھئے۔“
مگر نوکروں نے بھی اُسے سلسلی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

”اب تم کیا کہو گی۔“ حمید بولا۔ ”یہ بھی تمہیں پہچانتے سے انکار کرتے ہیں۔“
سلسلی براؤن غصیلی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سعید بابر سے کہا۔
”مسٹر بابر میں کیا سمجھوں۔ کیا آپ یہاں ایک اجنبی ملک میں مجھے ملازمت سے برطرف کرنا
چاہتے ہیں۔“

”کپتان صاحب! میں سچ جچ پاگل ہو جاؤں گا۔“ سعید بابر نے حمید سے کہا۔ ”یہ کوئی
بہت بڑی سازش ہے۔ اسے حراست میں لیجئے۔ مگر سلسلی براؤن..... وہ یقیناً خطرے میں ہوں
گی۔ یہ لڑکی نکل کر جانے نہ پائے ورنہ سلسلی براؤن کی موت کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔“
”آپ نتائج اخذ کرنے میں جلدی کر رہے ہیں۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔
پھر لڑکی سے بولا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ سلسلی براؤن تم ہو۔“
”ثبوت..... خدا کی پناہ..... ارے ثبوت میں میرے کاغذات موجود ہیں۔ میرا پاسپورٹ
جس پر میری تصویر موجود ہے۔“

”میں پاسپورٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”میں ابھی لاتی ہوں.....“ وہ اٹھ کر عمارت کے اندر جانے لگی۔
”ہائیں..... ہائیں۔“ سعید بابر تھیرانہ انداز میں چیخا۔ ”اندر کہاں..... خبردار۔“
لڑکی نے دروازے پر رک کر اُسے غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ میرا
سامان بھی ہضم کر لیں گے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ اپنے صندوق سے پاسپورٹ
نکالوں گی۔“
”کیا میں خوب دیکھ رہا ہوں۔“ سعید بابر نے اپنے بازو میں زور سے چنگلی لی اور ”سی“
کر کے رہ گیا۔

”میں اور مسٹر بابر تمہارے ساتھ چلیں گے ٹھہرو۔“ حمید نے کہا اور سعید کو اپنے پیچھے
آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔

سرچکرا رہا ہے۔ وہ کم بخت میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔ یہ مکان بھوتوں کا مسکن ہے۔ میں اب یہاں
نہیں رہوں گی۔“

”تم مجھے اونیٹیں بنا سکتیں۔“ دفعتاً سعید بابر گر جا۔ ”یہاں ایک سرکاری آفیسر بھی موجود
ہیں سمجھیں۔“

”مسٹر بابر.....!“ لڑکی نے تھیرانہ آواز میں کہا۔

”تم کون ہو۔ کیا چاہتی ہو۔“ سعید بابر نے سخت لہجے میں کہا۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ لڑکی ہاتھ ہلا کر رو دینے کے سے انداز میں ہنسی۔
”ہاں.....!“ قاسم بڑے خلوص سے بڑبڑایا۔ ”آپ خواہ مخواہ مذاق کر رہے ہیں۔ ان کی
طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں پوچھتا ہوں تم کون ہو۔“ سعید بابر جھلا گیا۔ ”سیدھی طرح بتاؤ، ورنہ میں پولیس کو
رنگ کروں گا۔“

”مسٹر بابر کیا آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ لڑکی بھی چیخ پڑی۔ ”آپ مجھے نہیں
پہچانتے..... سلسلی براؤن کو نہیں پہچانتے۔“

”سلسلی براؤن.....“ بابر حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”تم مجھے اندھا بنا رہی ہو۔ پاگل بنا رہی ہو۔ تم
سلسلی براؤن ہو، دن دھاڑے میری آنکھوں میں دھول جھونک رہی۔“

”میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تم مجھے جھٹلا رہے ہو۔“ لڑکی اپنے بال نوچنے لگی اور حمید بوکھلا
گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے جھوٹا سمجھے اور کسے سچا۔

”آئیں..... یہ تمہارے قدم کی برکت ہے..... ہاں۔“ قاسم نے ہنس کر حمید سے کہا۔
حمید اس کی طرف دھیان دیئے بغیر بولا۔ ”آپ سب براہ کرم خاموش رہیں۔“ پھر اس
نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تم سلسلی براؤن ہو۔“

”میں نہیں جانتی۔“ لڑکی غرائی۔ ”یہ اچھا مذاق ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں
سلسلی براؤن ہوں۔ مسٹر بابر اگر آپ نے مجھے اس طرح ذلیل کرنا تھا تو یہاں لائے کیوں تھے۔“
”مسٹر بابر..... تمہیں سلسلی براؤن تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

ان کاغذات کے سامنے کوئی وقت نہیں رکھتے..... یا پھر آپ کوئی ٹھوس ثبوت پیش کیجئے
پسلی براؤن نہیں ہے۔“

”میں ڈوب گیا۔“ سعید بابر آہستہ سے بڑبڑایا بلکہ اسی انداز میں جیسے خود سے مخاطب
پھر اُس نے حمید سے کہا۔ ”کیا آپ کی موجودگی میں مجھ پر فائر نہیں کیا گیا تھا۔“
”آپ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فائر آپ ہی کے لئے تھا۔ ہو سکتا ہے نشانہ اور
وئی رہا ہو۔ آپ کے علاوہ کمرے میں پانچ افراد اور بھی تھے۔“

”ان حالات میں..... جبکہ..... میرا بھائی۔“
”اس کے لئے بھی آپ کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ محض شبہات کی بناء پر وہ
تیر آپ کا بھائی نہیں ہو سکتا۔ اپنے بھائی کی تلاش جاری رکھئے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی بناء پر آپ
کے سامنے نہ آنا چاہتا ہو۔“
”آپ تو میرا بیڑا ہی غرق کئے دے رہے ہیں۔“ سعید بابر نے گھبرائے ہوئے لہجے
میں کہا۔

”فی الحال آپ اس لڑکی کا معاملہ طے کیجئے۔“
”معاملہ کیا طے کرنا ہے۔ مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا ہے کہ اسے اپنے ساتھ رہنے
وں۔ یہ حوالات میں رہے گی۔ اس وقت تک جب تک کہ میری سیکریٹری لسنی براؤن کا پتہ نہ
بتادے۔ اس کے پاس اُس کے صندوقوں کی کنجیاں تک موجود ہیں۔“
”اچھی بات ہے۔“ حمید نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔ ”آپ براہ راست
پولیس سے رابطہ قائم کیجئے۔“

”لیکن آپ میری مدد نہیں کریں گے۔“ سعید بابر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ
آپ میرے دوستوں کے دوست ہیں۔“

”اور ایک ذمہ دار آفیسر بھی۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔
ڈرائنگ روم میں صرف راحلہ موجود تھی۔ قاسم وغیرہ جا چکے تھے۔ حمید سوچنے لگا کہ کم از
کم سلیمہ کو تو اس کا انتظار کرنا ہی چاہئے تھا۔

”چلو غھر چلیں۔“ قاسم نے لڑکیوں سے کہا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا سا نظر آنے لگا تھا۔
انگریز لڑکی بڑی تیزی سے چلتی رہی۔ ایک کمرے کے دروازے پر رک کر اُس نے کچی
نکالی اور اُسے ہینڈل کے سوراخ میں ڈال کر دروازہ کھولا اور کمرے میں چلی گئی۔
”یہ غلط ہے..... یہ نامکن ہے..... یہ لسنی کی چیزوں میں ہاتھ نہیں لگا سکتی۔“ سعید بابر
نے کہا اور حمید کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تھہریئے..... صبر سے کام لیجئے۔ زیادہ بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔“ حمید بولا۔
لڑکی پاسپورٹ لئے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ اُس کے چہرے پر شدید غصے کے
آثار تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ذرا سی ٹھیس پر پھٹ پڑے گی۔

”یہ لیجئے..... یہ ہے پاسپورٹ..... مگر مجھے یقین ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“
حمید پاسپورٹ ملے کر دیکھنے لگا..... تصویر اسی لڑکی کی تھی۔ نام لسنی براؤن، سکونت
نیروبی، پیشہ ملازمت اور پتہ سعید بابر ہی کا تھا۔ حمید نے پاسپورٹ سعید بابر کی طرف بڑھا دیا۔
”یہ فراڈ ہے۔ کھلا ہوا فراڈ۔ میں دلدل میں پھنس رہا ہوں۔“

”تم خود فراڈ ہو۔“ لڑکی بذیانی انداز میں چیچی اور حمید کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں گھسٹ
لے گئی۔ ”یہ دیکھئے..... یہ ساری چیزیں میری ہیں۔ یہ جوتے میرے پیروں میں فٹ ہوتے
ہیں، یہ بلبوسات میرے جسم پر فٹ ہوتے ہیں۔“
سعید بابر بھی کمرے میں گھس آیا تھا۔ لڑکی مختلف جوتے اور سینڈل پہن کر حمید کو
دکھانے لگی۔

”ان صندوقوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں۔“ اس نے کہا..... اور سعید بابر کو گھونہ دکھا کر
چنگھاڑی۔ ”یہ کمینہ پن ہے..... تم مجھے اس اجنبی دیس میں ملازمت سے برطرف نہیں کر سکتے۔
اگر یہاں کا قانون میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“
”آپ سن رہے ہیں۔“ سعید بابر نے حمید سے کہا۔

”ہاں میں سن رہا ہوں مگر سعید بابر! لیکن فی الحال کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے
کاغذات پولیس کو مطمئن کر دینے کے لئے کافی ہوں گے۔ آپ یا آپ کے تین نوکروں کے



تھے کر سکتے ہیں۔“

اچانک ریسپشن روم کے اردلی نے کمرے میں داخل ہو کر کسی کا وزیٹنگ کارڈ حمید کو دیا۔
”اوہو..... سعید بابر۔“ حمید بڑبڑایا۔ پھر اردلی سے پوچھا۔ ”تہا ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”اچھا کہہ دو میں آ رہا ہوں۔“

اردلی چلا گیا۔ حمید نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”پتہ نہیں اب وہ کیا سنانے آیا ہے۔“
”تم چلو! میں بھی آ رہا ہوں۔ اس آدمی کو کم از کم دیکھ ہی لوں۔ لیکن تم اُس سے میرا تعارف نہیں کراؤ گے۔“

”یعنی میں آپ سے گفتگو بھی نہیں کروں گا۔“

”نہیں قطعی نہیں۔“

حمید اٹھ گیا۔ ریسپشن روم میں سعید بابر اس کا منتظر تھا۔ حمید نے اُس کے چہرے پر دلی کیفیات پڑھ لیں۔ وہ بہت زیادہ پریشان معلوم ہوتا تھا۔

”کپتان صاحب! آپ خفا ہو کر چلے آئے تھے۔ حالانکہ میں مظلوم اور آپ کی امداد کا مستحق ہوں۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں کسی وجہ سے اس لڑکی کو سلسلی براؤن تسلیم نہیں کرنا چاہتا۔ کیا میں اتنا احمق ہوں کہ کاغذات کو جھٹلا کر خواہ مخواہ اپنی گردن پھنسانے کی کوشش کروں گا۔“
”یہی تو میں بھی نہیں سمجھ سکتا۔“

”اب میں آپ کو سلسلی براؤن کا پاسپورٹ دکھانے لایا ہوں۔ اُس وقت میں بہت زیادہ الجھن میں تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ سلسلی براؤن کا پاسپورٹ میرے ہی پاس موجود ہے۔“

اُس نے جیب سے ایک پاسپورٹ نکال کر حمید کی طرف بڑھا دیا۔ اس پاسپورٹ کی تصویر اس لڑکی سے مختلف تھی۔ بہت فرق تھا۔ زمین و آسمان کا فرق..... اتنے میں فریدی بھی ریسپشن روم میں آ گیا۔

”اچھا تو آپ نے اور اس سلسلی نے ساتھ ہی اپنی آمد یہاں یہاں درج کرائی تھی۔“

حمید نے پوچھا۔

”بکواس بند کرو۔ میرے کان نہ کھاؤ۔“ فریدی نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ حمید کو بڑی حیرت ہوئی۔ سعید بابر والا واقعہ ایسا ہی تھا کہ معمول کے مطابق فریدی کو اس میں کافی دلچسپی لینی چاہئے تھی۔ پھر حمید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ فریدی بولا۔ ”فی الحال صرف اتنی ہی بات میں قانون دلچسپی لے سکتا ہے کہ سعید بابر کے ڈرائنگ روم میں کسی نے فار کیا تھا وہ بھی اُس صورت میں جب سعید بابر اس کی اطلاع پولیس کو دے۔“

”بس اتنی سی بات۔“ حمید نے مایوسی سے کہا۔ ”مگر وہ اس لڑکی کا معاملہ۔“

”وہ بھی کچھ نہیں ہے۔ سعید بابر کو چاہئے کہ کیس کو اپنے سفارت خانے میں پیش کرے۔ ہم سے براہ راست اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے اگر تمہیں لڑکی کے معاملے میں تفتیش تفریبا کرنی ہو تو فارن برانچ میں جا کر اس کے ویزا کا انکوائری فارم نکلوا لو۔ اس پر سلسلی براؤن کی تصویر موجود ہوگی۔“

حمید اٹھ کر دفتر کے اُس کمرے میں آیا جہاں باہر سے آنے والوں کے کاغذات کا ریکارڈ رہتا تھا۔ اُس نے متعلقہ کلرک سے پچھلے ایک ماہ کے کاغذات نکالنے کو کہا۔ اُسے ان لوگوں کی آمد کی صحیح تاریخ کا علم نہیں تھا۔ کلرک نے دو ہی چار فارم الٹے تھے کہ حمید کی نظر اُسی لڑکی کی تصویر پر پڑی جو سعید بابر کے یہاں بیہوش ملی تھی۔ اس نے فارم کا ایک ایک کالم دیکھ ڈالا اور پھر اُسے تسلیم کر لینا پڑا کہ سلسلی براؤن اُس لڑکی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

حمید پھر فریدی کے کمرے میں واپس آیا۔ فریدی غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ پھر بولا۔
”بس تو یہ سعید بابر کوئی فراڈ کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے وہ اُس لڑکی سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ مگر وہ بڑا احمق معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کاغذات کی موجودگی میں اس کی بات کون سنے گا۔“

”نہیں جناب! وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کی کوئی حرکت کرے۔ وہ کافی چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی کسی سازش کا شکار ہو گیا۔ مگر کسی شکایت کے بغیر ہم کوئی کارروائی

”جی ہاں..... ہم دونوں ساتھ آئے تھے۔ انکواری فارم تو ہوگا آپ کے یہاں۔ آپ اپنا اطمینان کر لیجئے۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی نے اُسے آنکھ ماری۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ اسے دوسرے انکواری فارم کا تذکرہ کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔

”اچھا جناب.....!“ حمید نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”آپ یہ پاسپورٹ میرے پاس چھوڑ دیجئے۔ میں دیکھوں گا۔“

”مگر میں سلسلی کے لئے کیا کروں۔ وہ صرف دو گھنٹے کے لئے باہر گئی تھی لیکن چار گھنٹے گزر چکے ہیں کپتان صاحب! پتہ نہیں وہ کس حال میں اور کہاں ہوگی۔ اُس کے لئے کچھ کیجئے۔ آپ میرے دوستوں کے دوست ہیں۔ آپ پر میرا حق ہے۔“

”وہ کہاں گئی تھی۔“

”اس نے کسی جگہ کا نام نہیں لیا تھا۔ بس وہ پولیس رپورٹوں کے جھوم سے گھبرا کر چلی گئی تھی۔“

”میں دیکھوں گا کہ اُس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”اچھا وہ لڑکی اس وقت کہاں ہے۔“

”میں اُسے نوکروں کی نگرانی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ویسے وہ سلسلی براؤن اس لئے بنی ہے کہ ہر وقت میرے سر پر سوار رہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ سلسلی براؤن کی زندگی خطرہ میں ہوگی۔ کچھ کیجئے۔“

حمید نے فریدی کی طرف دیکھا جو سعید باہر کو بخور دیکھ رہا تھا۔

”میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ آپ مطمئن رہئے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

سعید باہر زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ فریدی اس دوران میں خاموش ہی رہا تھا۔ سعید کے چلے جانے پر وہ اٹھا اور حمید سے مخاطب ہوئے بغیر ریسپشن روم سے چلا گیا۔

حمید ایک بار پھر ریکارڈ روم میں بیٹھا فارموں کا فائل الٹ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس پاسپورٹ کا ویزا انکواری فارم فائل میں موجود نہ ہوگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں اس کی کھوپڑی تاپنے لگی کیونکہ اس دوسری سلسلی براؤن کا انکواری فارم بھی فائل میں موجود تھا اور اس لڑکی کی

۔ یہی اسی تاریخ کو ہوئی تھی جس تاریخ کو دوسری لڑکی کی ہوئی تھی۔

وہ سنائے میں آ گیا..... اپنی نوعیت کا واحد کیس..... وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔

حیرت انگیز نشانات

سعید باہر بے خبر سو رہا تھا۔ اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ پتہ نہیں وہ کسی قسم کی آواز تھی یا سعید باہر کی چھٹی حس..... جس نے اُسے جگا دیا تھا وہ اٹھ بیٹھا۔ کمرہ کی کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ سعید نے کھڑی کی طرف دیکھا دو بج رہے تھے۔ سردیوں کی پہاڑی رات کائنات پر مسلط تھی۔ دفعتاً اُسے داہنی طرف کی کھڑکی میں ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی، وہ دبے پاؤں بستر سے اُٹا۔ اُس کے چہرے پر ذرہ برابر بھی بے اطمینانی یا پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ وہ بچوں کے لمبے چلتا ہوا میز کے قریب آیا۔ بآہستگی اس کی دراز کھینچی اور اندر ہاتھ ڈال کر ایک ریوالور نکالا جس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ اُس نے اُس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

کمرے میں مدھم سی نیلے رنگ کی روشنی تھی۔ اچانک وہی کھڑکی اپنے فریم سمیت ہلنے لگی جس میں سرسراہٹ کی آواز ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ فریم سمیت دیوار سے نکل کر فرش پر آ گرے گی۔ چاروں طرف کا پلاسٹر اُڑھڑاتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک وہ فرش پر آ گری اور ساتھ ہی سعید نے دیوار کی خلاء میں فائر کر دیا۔

ایک چیخ دور تک سنائے میں لہراتی چلی گئی۔ مگر وہ چیخ نہیں ہو سکتی تھی، وہ تو کسی ریلوے ٹرک کی سیٹی تھی۔ اُس کے فوراً بعد ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ریلوے انجن پے درپے پے ٹیم چھوڑ رہا ہو۔ پھر بھاگتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں۔ سعید باہر نے ریوالور خالی کر دیا۔ ذرا ہی سی ڈیر میں پھر وہی پہلے کا سا سناٹا طاری ہو گیا، لیکن سعید باہر نے اپنے کمپاؤنڈ ٹیسٹ کی کار اشارت ہونے کی آواز سنی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ کار وہیں سے اشارت ہوئی۔

پھر وہ بڑی تیزی سے باہر نکلا۔ ساری عمارت ہنسان پڑی تھی۔ لیکن اب وہ اتنا احتیاط بھی نہیں تھا کہ کمپاؤنڈ میں تاراج روشن کرتا۔ نوکروں کے کوارٹروں میں بھی روشنی نہیں نظر آ رہی تھی۔ انہیں وہ سو رہے تھے یا خوف کی وجہ سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ سعید تھوڑی دیر تک

برآمدے میں کھڑا رہا پھر اندر چلا گیا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا فون کی طرف گیا اور محض ہندسوں کی ترتیب کو ذہن میں رکھ کر اندھیرے ہی میں کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری بار ریسیور اٹھایا گیا۔

”ہیلو.....!“ دوسری طرف سے ایک بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔

”میں کیپٹن حمید صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کون صاحب ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”اُن سے کہئے کہ سعید بابر فون پر ہے۔“

”وہ سو رہا ہے۔“

”آپ کون ہیں؟“

”فریدی.....!“

”اوہ..... کرنل صاحب..... معاف فرمائیے گا۔ میں نے ناوقت آپ کو تکلیف دی۔ میں خطرے میں ہوں جناب..... کسی نے میری خواب گاہ کی کھڑکی گرا کر اندر گھسنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے فائر کر دیا۔ اب سنا ہے، لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ روشنی کر سکوں۔“

”کیا کہا آپ نے..... کھڑکی گرا دی گئی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”جی ہاں..... فریم سمیت دیوار سے نکل آئی ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔“

”مجھے خود حیرت ہے جناب..... میں کسی قسم کی آواز سن کر جاگ پڑا تھا۔ میں نے کھڑکی کے چاروں طرف کا پلاسٹر ادھڑتے دیکھا۔ پھر فریم اپنی جگہ سے کھسکا اور پوری کھڑکی اندر آگری۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ اُس پر زور آزمائی کر رہا ہو، ہیلو..... جی ہاں..... آپ خود سوچئے..... مجھے بالکل تنہا سمجھے۔ میں نے چھ فائر کئے تھے، لیکن نوکروں کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ وہ بدستور اپنے کوارٹروں میں ہیں۔“

”لوکی کہاں ہے۔“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ رات کا کھانا اُس نے زبردستی میرے ساتھ کھایا تھا اور لسل

بازن کے کمرے میں سونے چلی گئی تھی۔ اب ایک اور مصیبت آگئی ہے، ہم اپنے یہاں کے اہم الامور کے دفتر میں گئے تھے، وہاں سے حکم ملا ہے کہ انکوائری کے درمیان میں اُسے اپنی عمرانی میں رکھوں۔“

”جی ہاں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی ”میں آ رہا ہوں، آپ جہاں ہیں وہیں ٹھہریئے، پتا وہ کھڑکی باہر ہی کی طرف سے کھلتی رہی ہوگی۔“

”جی ہاں۔“

”کس طرف۔“

”بائیں بازو کی..... دیکھئے بتاتا ہوں، چوتھی..... نہیں پانچویں..... ہاں پانچویں ہی تو ہے دیکھئے وہ بائیں بازو کی پانچویں کھڑکی ہے۔“

”اچھا..... آپ وہیں ٹھہریئے جہاں اس وقت ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور مسئلہ منقطع کر دیا گیا۔ سعید بابر چند لمحوں میں کھڑا رہا پھر ٹٹولتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔ کئی جگہ تو لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ لیکن وہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر ایک کمرے میں گھس کر اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

لیکن زیادہ دیر تک اندر نہیں ٹھہرا۔ اب وہ پھر اُسی کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں ٹھہرنے کی فریدی نے تاکید کی تھی۔ اب کیا وقت تھا۔ سعید اندازہ نہیں کر سکا۔ لیکن اُسے اس کا احساس تھا کہ فون کرنے کے بعد سے اب تک ایک گھنٹے کی مدت ضرور گزری ہوگی۔

اچانک اندر گھنٹی بجی۔ شاید برآمدے میں کوئی گھنٹی کا بٹن دبا رہا تھا۔ سعید نے سوچا آنے والا فریدی کے علاوہ اور کون ہوگا۔

وہ برآمدے کی طرف جھپٹا..... برآمدے میں اندھیرا تھا۔

”مسٹر بابر.....!“ کسی نے برآمدے سے کہا۔

”کون..... اوہ..... کیا..... کرنل صاحب۔“

”ہاں..... میں ہوں..... اب آپ روشنی کر سکتے ہیں۔“

سعید بابر نے سوچ بورڈ ٹٹول کر برآمدے میں روشنی کر دی۔ اس کے سامنے ایک دروازہ

آدمی سیاہ السر اور سیاہ فلت ہیٹ میں کھڑا تھا۔ روشنی ہوتے ہی اس نے فلت ہیٹ کا گورہ اوپر اٹھا دیا۔ سعید بابر کو ابھی تک فریدی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ویسے اس نے اس کی شہرت بہت پہلے سنی تھی۔ افریقہ کے پولیس افروں میں اکثر اس کے تذکرے رہا کرتے تھے کیونکہ وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا۔

”خوش آمدید.....!“ سعید بابر ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ”ہم پہلی بار مل رہے ہیں کرنل صاحب! آپ کے متعلق میرا اندازہ غلط تھا، آپ تو مجھ سے بھی کم عمر معلوم ہوتے ہیں۔“

”میں آپ کی خواب گاہ دیکھنا چاہتا ہوں مسٹر بابر۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

اس دوران میں اس کی نظر ایک بار بھی سعید بابر کے چہرے سے نہیں ہٹی تھی۔

”اوہ..... جی ہاں..... آئیے۔“ سعید بابر نے کہا اور آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں اسے راستہ دکھانے لگا۔

وہ خواب گاہ میں آئے جہاں کھڑکی فریم سمیت اب بھی فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے دونوں طرف ادھرے ہوئے پلاسٹر کے ڈھیر تھے۔ فریدی چند لمحوں کے اندر نظر سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”آپ نے شاید وہاں سے فار کیا تھا۔“

”جی ہاں وہیں سے۔“

”آپ کے فار سے کوئی زخمی ہوا ہے، کیونکہ باہر دیوار پر خون ہے۔“

”اوہ..... میں نے ایک چیخ سنی تھی..... مگر.....!“

”مگر..... کیا.....!“

”میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ چیخ ہی تھی۔ جناب عجیب طرح کی آواز تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ریلوے انجن کی سیٹی ہو۔ پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے انجن رہ رہ کر تیزی سے اسٹیم چھوڑ رہا ہو۔“

”جناب میری معلومات میں کوئی نیا اضافہ ہونے والا ہے۔“ فریدی مسکرایا۔

”یقین کیجئے..... جو کچھ میں نے سنا تھا عرض کر دیا۔“

”اس کھڑکی کے نیچے کچھ بڑے عجیب قسم کے نشانات ہیں۔“ فریدی نے دیوار کی خلاء کی

طرف اشارہ کیا اور پھر سعید بابر کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”ان نشانات کا مطالعہ میرے لئے بڑا دلچسپ ثابت ہوگا۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”کیسے نشانات ہیں۔“

”اگر آپ دیکھنا چاہیں.....!“

”میں ضرور دیکھوں گا.....!“ سعید بابر نے کہا اور فریدی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں کپاونڈ میں آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ عمارت کے بائیں بازو کی طرف پہنچ کر فریدی رک گیا اور بولا۔

”ذرا احتیاط سے..... میں روشنی دکھا رہا ہوں۔ کہیں وہ نشانات ضائع نہ ہو جائیں۔“

وہ پھر چلے۔ فریدی زمین پر روشنی ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کہیں کہیں وہ سعید بابر سے کترا کر چلنے کو کہتا۔ کھڑکی کے سامنے وہ رک گئے۔

”یہ نشانات.....!“ فریدی نے ایک جگہ روشنی ڈالی۔

یہاں زمین نرم اور نرم آلود تھی اس لئے نشانات کافی گہرے تھے۔ سعید بابر جھک کر دیکھنے لگا۔ لیکن شاید اُس کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو کر بے دلی سے بولا۔ ”جی ہاں..... یہ نشانات.....!“

”شاید آپ نے غور سے نہیں دیکھا۔“ فریدی مسکرایا۔ ”ورنہ آپ کے چہرے پر حیرت کے آثار ضرور ہوتے۔“

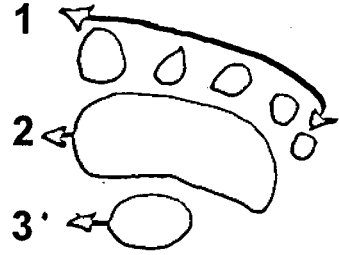
”یہ حقیقت ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔“

”یہ نشانات دور تک ہیں اور ان کی ترتیب بتاتی ہے کہ یہ کسی ایسے جانور کے پیروں کے نشانات ہیں جو صرف دو پیروں سے چلتا ہے۔“

”گور پلا.....!“ سعید بابر بڑبڑایا۔

”نہیں گوریلے کے پیروں سے ہیں۔ تلوؤں میں اتنی گہرائی نہیں ہوتی..... یہ دیکھئے۔“

فریدی ایک تنکا اٹھا کر نشان کے مختلف حصوں کی طرف اشارہ کرنے لگا۔



”یہ انگلیاں⁽¹⁾..... یہ انگلیوں کے⁽²⁾ نیچے کا ابھار..... اور یہ گول نشان⁽³⁾..... جو ایڑی ہی کا ہو سکتا ہے۔ ایڑی اور انگلیوں کے نیچے کے ابھار کا فاصلہ دیکھئے۔ تلوے کتنے گہرے ہیں۔ گوریلے کے تلوؤں میں گہرائی نہیں ہوتی۔ یہ کسی آدمی کا پیر ہو ہی نہیں سکتا۔ مختلف قسم کے جانوروں کے متعلق ”میری معلومات کم نہیں ہیں۔ مگر یہ پیر..... یقیناً میری معلومات کے دائرے سے باہر ہے۔“

”پھر یہ کیا ہے۔“ سعید بابر کی آواز حلق میں پھنسنے لگی تھی۔

”خدا بہتر جانتا ہے.....!“ فریدی سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ”میں اپنے فوٹو گرافروں کو بلانا چاہتا ہوں..... آپ کا فون استعمال کروں گا۔“

”اوہ..... ضرور..... ضرور.....!“

”فریدی نے دوبارہ عمارت میں داخل ہو کر اپنے محکمے کے فوٹو گرافر کو فون کیا اور وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔“

سعید بابر کا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ فریدی نے ایک بار پھر اُسے غور سے دیکھا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ پھر اُس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”جتنی جلد ہو سکے آپ یہاں سے چلے جائیے۔“

سعید بابر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔

”کرنل صاحب میرا بھائی اگر ایڑیاں رگڑ کر مر گیا۔ میں اُسے تین ہزار روپے بھجواتا رہا اور

”بٹ پاتھ پر گھسٹ گھسٹ کر بھگ بھگتا رہا۔ خواہ میری جان چلی جائے میں اس آدمی کو سزا دے بغیر نہیں جاؤں گا، جو اس حرکت کا ذمہ دار ہے۔ آپ خود سوچئے۔ اگر آپ کا کوئی بھائی.....!“

”آپ نے الائیڈ بنک میں تحقیق کی تھی۔“

”جی ہاں..... ہر ماہ تین ہزار کا ڈرافٹ رشید بابر کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہا تھا اور رشید بابر کے چیک پر ادا کی گئی ہوتی رہی تھی۔ میرے یہاں پہنچنے سے تین دن قبل آخری رقم پچاس ہزار نکالی گئی اور اسی دن شام کو میرے بھائی کی لاش ایک فٹ پاتھ پر ملی۔ میرے ذرا..... کتنی زبردست ٹریجڈی ہے۔“

”پہلے ڈرافٹ پر کس نے تصدیق کی تھی کہ یہی رشید بابر ہے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”میجر داراب نے۔“

”یہ کون ہے۔“

”داراب اینڈ کمپنی کا پروپرائٹر..... اس کی فرم ہم سے لین دین رکھتی ہے۔ میں نے اُسے لگہ دیا تھا کہ وہ اس ڈرافٹ کی تصدیق کر کے رشید بابر کا اکاؤنٹ کھلوا دے۔“

”آپ اس سلسلے میں اس سے ضرور ملے ہوں گے۔ قدرتی بات ہے۔“

”جی ہاں..... میں اُس سے بھی پوچھ گچھ کر چکا ہوں۔“

”وہ کیا کہتا ہے۔“

”اُسے کچھ یاد نہیں۔ بات پانچ سال پرانی ہے۔ میرے یاد دلانے پر اُس نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ اُس نے میرے لکھنے پر کسی کے ڈرافٹ کی تصدیق کی تھی۔ جب اسے اس کا نام بھی یاد نہیں تو پھر صورتِ شکل یاد رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”داراب سے آپ پہلی بار کب ملے تھے۔“

”بس ابھی حال ہی میں۔ البتہ کاروباری تعلقات شاید پندرہ سال پرانے ہیں۔“

”یعنی اس ڈرافٹ کی تصدیق سے پہلے اُس نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔“

”جی نہیں..... میں نے عرض کیا تا کہ ابھی حال ہی میں ہم دونوں ایک دوسرے کے

صورت آشنا ہوئے ہیں۔“

”تب تو وہ اس واقعہ کو بھلا دینے میں حق بجانب ہے۔“ فریدی نے کہا۔
 ”کیوں.....؟ میں نہیں سمجھا۔“

”اگر وہ آپ کو پہلے دیکھ چکا ہوتا تو رشید باہر اُسے آج بھی یاد ہوتا۔ محض اتنی قریبی مشابہت کی بناء پر حیرت انگیز چیزیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ کیوں..... مثلاً یہ آپ کی سیکریٹری والا قصہ مجھے یاد رہے گا۔“

”اور شاید میں اُسے قبر میں یاد کر کے متحیر ہوتا رہوں۔“ سعید باہر نے تلخ لہجے میں کہا۔
 ”یہ لڑکی لسللی براؤن کب سے آپ کے پاس ہے۔“
 ”تقریباً تین سال سے۔“

”آپ کو اچھی طرح یاد ہے۔“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”جی ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

”تو پھر نیر دبی سے آئی ہوئی اطلاعات غلط ہوں گی۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔
 ”کیا مطلب.....؟“ سعید باہر بیساختہ چونک پڑا۔

”میں نے آج ہی بذریعہ وائریس ٹیلی گرافی یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ آپ کی فرم سے تعلق رکھنے والا ایک فرد بھی لسللی براؤن نامی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔“

”اوہ.....!“ سعید باہر ہنسنے لگا۔ فریدی استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔
 ”آپ نے یہی پوچھا تھا کہ وہ کب سے میرے پاس ہے۔“

”ہاں! یہی پوچھا تھا۔“

”یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ وہ میری سیکریٹری کب سے ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے تو میں عرض کرتا کہ وہ صرف کاغذات پر میری سیکریٹری ہے اور کاغذات پر بھی اُس وقت آئی جب ہم پاسپورٹ بنوانے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ میرے اور اس کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔
 سچ پوچھئے تو یہ ستر محض اسی کے اصرار پر ہوا تھا، مگر اب.....“

سعید باہر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”اب میں نے اُس کو دیا ہے۔“

”محبوبہ.....!“ فریدی مسکرایا۔

جواب میں سعید باہر نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔



عدنان اپنے گھر میں ایک طرح سے قید ہی تھا۔ وہ تنویر کی عدم موجودگی میں بھی گھر سے ذم نہیں نکال سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اُسے اپنی اس ناعاقبت اندیشی پر زندگی بھر پشیمانی ہوتی کیونکہ یہاں تنویر کی حکومت تھی۔ اگر وہ گھر سے باہر جانے پر زور دیتا تو ملازمین اس کی بے وزنی تک کر بیٹھتے۔

وہ اپنی ماں کی سخت گیریوں سے تنگ آ گیا تھا۔ مگر قہر درویش پر جاں درویش، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا۔ اُس کی دانست میں اس کی ماں کریک تھی۔
 مگر وہ اپنی ماں ہی کا بیٹا تھا۔ وہ زیادہ تر ایسی ہی حرکتیں کرتا جو تنویر کو ناپسند تھیں۔

آج صبح ہی تنویر کہیں گئی ہوئی تھی۔ دو باڈی گارڈ اس کے ساتھ تھے۔ عدنان کے باڈی گارڈ گھر ہی پر موجود تھے۔ اس نے انہیں طلب کیا۔

”تم دونوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام بھی کیا ہے۔“ عدنان نے بڑی حقارت سے پوچھا۔
 وہ دونوں خاموش رہے۔

”کیا تم بہرے ہو۔“ عدنان گرجا۔

”نہیں جناب! ہم آپ کا سوال ہی نہیں سمجھ سکے۔“

”تم بڑا کام نہیں سمجھتے..... کیوں؟“

”سمجھتے تو ہیں..... مگر سوال کا مقصد سمجھ بغیر جواب کیسے دیا جاسکتا ہے۔“

”آج تمہیں ایک بڑا کام انجام دینا ہے۔“

”فرمائیے۔“

”اُس کمرے کا تالا توڑیں گے جس میں مادام تنویر کے علاوہ اور کوئی نہیں جاتا ہے۔“

”ہم سے یہ نہیں ہو سکے گا جناب۔“

”کیا تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو۔“

”جہاں مادام تنویر کی کوئی بات آپڑے وہاں ہم یقیناً انکار کر دیں گے۔“

”میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“ عدنان گرجا۔

”گولی مار دیجئے..... مگر یہ بڑا کام ہم سے نہیں ہو سکے گا۔“

عدنان خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مسکرا کر نرم لہجے میں بولا۔ ”مادام تنویر کو اس کا علم نہیں ہونے پائے گا۔ تم آخر اتنا ڈرتے کیوں ہو، تم میرے باڈی گارڈ ہو۔ تمہارے تعلق براہ راست مجھ سے ہے۔ تمہارے افعال کے لئے میں جوابدہ ہوں۔“

”ہم مجبور ہیں جناب۔“

وہ دونوں منہ لٹکائے ہوئے چلے گئے۔ عدنان کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر تنویر کے نجی آفس کی طرف چلا گیا۔ یہاں تین لڑکیاں کلرک تھیں، جو تنویر کے نجی اخراجات کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ عدنان نے ان میں سے ایک کو الگ بلایا، یہ لڑکی ابھی حال ہی میں آئی تھی اور شاید اُسے اس عمارت کے مینوں کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا، تنویر کو بھی اُس نے ایک آدھ بار دیکھا تھا۔

”تم مجھے جانتی ہو۔ میں عدنان ہوں۔“ عدنان نے اُس سے کہا۔

”جی ہاں.....!“

”میرا ایک کام کرو گی۔“

”فرمائیے۔“

”اگر تم میری مدد کرو گی تو ہم ہمیشہ کے لئے گہرے دوست بن جائیں گے۔“

”ہاں..... ہاں..... بتائیے۔“ لڑکی نے کہا۔ عدنان عورتوں کے لئے پرکشش تھا۔

”میری ماں لیمو بہت پسند کرتی ہے، مگر مجھے نہیں کھانے دیتی۔ میں اس کے لیمو چرانا

چاہتا ہوں۔“

لڑکی ہنسنے لگی اور عدنان بولا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ ایک کمرے میں لیموؤں کا اشاک رہتا ہے۔ میں تمہارے لئے بھی نکال لاؤں گا۔ بس تم راہداری کے سرے پر کھڑی

جی رہنا کہ کوئی اُدھر آ تو نہیں رہا ہے۔“

”چلئے.....!“ لڑکی پھر ہنس پڑی۔ وہ دونوں اُس راہداری میں آئے جس کے دوسرے

سرے پر اُس پراسرار کمرے کا دروازہ تھا۔ لڑکی راہداری کے اسی سرے پر رک گئی۔

عدنان نے جیب سے ایک مڑا ہوا تار نکالا اور دروازے میں پڑے ہوئے قفل پر ہاتھ

بٹانے کرنے لگا۔ قفل کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ اُس نے دروازے میں تھوڑا سا درہ کیا۔ کمرے

میں گہری تاریکی تھی۔ اندر سے ایک عجیب قسم کی بدبو کا بھپکا آیا لیکن عدنان جو تنویر کا بیٹا تھا

دروازہ کھول کر دھڑ دھڑاتا ہوا اندر گھس گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ راہداری میں تھا۔ اُس کے

پتے سے ایک عجیب سی چیخ نکلی کسی نے اُسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا تھا۔ لڑکی تو یہ

واقعہ دیکھتے ہی سر پر پیر رکھ کر بھاگ گئی۔ عدنان کے گھٹنوں اور سر میں کافی چوٹیں آئیں۔

دوسری طرف اُس کے باڈی گارڈ چیخ سن کر دوڑ پڑے تھے۔ سامنے والے کمرے کا

دروازہ بند تھا لیکن قفل انہیں راہداری کے فرش پر پڑا دکھائی دیا۔ انہوں نے خوفزدہ نظروں سے

ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے عدنان کو اٹھانے لگے۔ وہ اسے سہارا

دیتے ہوئے راہداری سے نکال لائے۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ٹھیک اُسی وقت تنویر بھی آ پہنچی۔ عدنان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی

تھیں۔ اُس نے باڈی گارڈوں سے اس کے متعلق پوچھا۔ پہلے تو وہ ہچکچاتے رہے، لیکن پھر

انہیں بتانا ہی پڑا کہ عدنان نے اُس کمرے کا قفل کھول لیا تھا۔

تنویر بے تحاشہ دوڑتی ہوئی راہداری میں چلی گئی۔ عدنان ایک کرسی میں پڑا ہانپتا رہا۔

”میں تم دونوں کو جان سے مار دوں گا..... سمجھے!“ وہ انہیں گھونہ دکھا کر بولا۔

”ہم کیا کرتے جناب۔“

”شت اپ.....!“

دو چار منٹ بعد تنویر واپس آ گئی، لیکن اُس کا موڈ بہت خراب معلوم ہو رہا تھا اور اس کے

ہاتھ میں چمڑے کا چابک تھا۔

”عدنان! کھڑے ہو جاؤ۔“ اُس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

عدنان چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ چاروں باڈی گارڈ وہیں کھڑے تھے۔
”تم لوگ جاؤ۔“ عدنان نے اُن سے کہا۔

”نہیں..... وہ یہیں ٹھہریں گے۔“ تویر نے سر دلچے میں کہا۔ ”تم اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“
عدنان نے ہاتھ بھی اٹھا دیئے۔ تویر کا چابک والا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔

”شائیں... شائیں۔“ عدنان کے پشت پر چابک پڑ رہے تھے اور وہ ہونٹ جھینچے کھڑے تھے۔
”میں گن رہا ہوں۔“ عدنان نے تلخ لہجے میں کہا۔

”گنتے رہو۔“ تویر کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا۔
”یہ پتھر پر نہیں..... میرے جسم پر پڑ رہے ہیں مادام تویر..... مگر میرے سینے میں بھی پتھر

کادل ہے۔“

”تمہاری دھمکیاں مجھے اور زیادہ سنگدل بنادیں گی۔“ تویر بولی۔ لیکن اس کا ہاتھ چلتا رہا۔
کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُسے روک دیتا۔ باڈی گارڈ کھڑے کانپتے رہے۔

”میں بس نہیں کہوں گا..... مادام تویر۔“ عدنان نے کہا۔ ”اور نہ رحم کی درخواست کروں گا۔“
تویر کا ہاتھ رک گیا۔ چابک فرش پر ڈال کر وہ کرسی میں گر گئی۔ اس کی آنکھیں بڑی

خنخو اور نظر آ رہی تھیں۔ اچانک عدنان نے چابک اٹھایا اور چاروں باڈی گارڈوں پر ٹوٹ پڑا۔
”الو کے پٹھو..... میں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔“

باڈی گارڈ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ نکلے۔

میجر داراب

حمید کے لئے یہ گتھی عجیب تھی۔ مگر اُسے اس گتھی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس الجھاؤ میں کسی عورت کو بھی دخل ہوتا تھا، وہ کم از کم حمید کی ذہنی جمناسٹک سے بچا ہی رہتا تھا۔ کیونکہ حمید پھر حمید ٹھہرا..... ظاہر ہے کہ عورت اُس کے ہسے میں آئی اور گتھی فریدی کے ہسے میں۔

ہیت کرنا فریدی کا کام تھا کہ وہ لڑکی حقیقتاً سلسلی براؤن تھی یا کوئی اور۔ حمید کے لئے تو وہ صرف لڑکی تھی۔ اگر اس کا نام سلسلی براؤن کی بجائے کیوی بوٹ پالش براؤن ہوتا تب بھی وہ اس میں اتنی ہی دلچسپی لیتا۔

وہ سعید بابر کی کوشی کے چکر لگانے لگا۔ دن میں کئی کئی بار کوئی نیا سوال تیار کر کے جا پہنچتا اور سعید بابر اس بات پر بے تحاشہ خوشی کا اظہار کرتا کہ حکمہ سراغ رسانی کے دو بہترین دماغ اس کے معاملے میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔

آج اچانک اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی جسے سعید بابر کزی نگرانی میں رکھتا تھا اور اُسے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا تھا۔ وہ حمید کو برآمدے ہی میں ملی اور اُس کے سر پر دو نوکر مسلط تھے۔ سعید بابر گھر میں موجود نہیں تھا۔

لڑکی نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”وہ شریف آدمی گھر پر موجود نہیں ہے۔“

”اوہ..... اچھا.....!“

”لیکن ٹھہریئے..... میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوہ..... ضرور..... ضرور.....!“ حمید وہیں ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

”مجھے یہ سزا کیوں دی گئی ہے۔ کیا آپ بتا سکیں گے۔“

”سزا تو تم نے آج کل ہم لوگوں کو دے رکھی ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”کیا آپ لوگ نیروبی سے براہ راست نہیں معلوم کر سکتے۔ میں آپ کو اپنے عزیزوں

اور رشتہ داروں کے پتے دے سکتی ہوں۔“

”کیا وہ لوگ اس کی بھی تصدیق کر سکیں گے کہ تم سعید بابر کی سیکریٹری ہو۔“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اُس کے چہرے کی رنگت بڑی تیزی

سے بدل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھایا۔ اُس کی آنکھیں غمگین تھیں اور چہرے پر

پہلے سے زیادہ زماہٹ تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں اس کی تصدیق نہیں کر سکیں گے۔“

”اس کا جواب وہی ذلیل کتاب دے سکتا ہے۔ لیکن اب تو وہ مجھے سلسلی براؤن ہی تسلیم

”آپ میرے ساتھ باہر چل سکتی ہیں۔“
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔!“ لڑکی پر مسرت انداز میں چینی۔
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔!“

”مگر یہ۔۔۔۔۔!“ لڑکی نے نوکروں کی طرف دیکھا۔
 ”میں انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ حمید نے نوکروں سے کہا۔
 ”صاحب کی اجازت نہیں ہے۔“ ایک نوکر نے بڑے ادب سے جواب دیا۔
 ”ان سے کہہ دینا کپتان صاحب اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“
 ”ان کا انتظار کر لیجئے تو بہتر ہے۔“

حمید نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ وہ سمجھتا تھا کہ لڑکی اس طرح باہر نہیں جاسکے گی۔ لہذا
 اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ سعید کا انتظار ہی کرے۔
 آج کل ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں رقص کے پروگرام ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ
 اگر یہ لڑکی اس کے ساتھ ہوئی تو کلب میں اس کی خاصی دھوم رہے گی۔
 اُسے تقریباً آدھے گھنٹے تک سعید باہر کا انتظار کرنا پڑا پھر جیسے ہی وہ آیا حمید اسے اپنے
 ساتھ لیتا ہوا اندر چلا گیا۔ لڑکی برآمدے ہی میں رہ گئی۔
 ”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کپتان صاحب لیکن میری زندگی خطرے میں ہے۔“
 ”مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔“ حمید بولا۔
 ”میں ابھی تک دراصل اپنے ہی ایک معاملے میں ادھر کے چکر لگا رہا ہوں۔“
 ”میں نہیں سمجھا۔“

”بھئی بات یہ ہے کہ ویزا انکوائری سیکشن میرے ہی چارج میں ہے اور میں آج آپ پر
 یہ حقیقت واضح کر رہا ہوں کہ دونوں لڑکیوں کے انکوائری فام ریکارڈ روم میں موجود ہیں۔
 دونوں ہی سلسلی براؤن اور مسٹر سعید باہر کی سیکرٹری۔“
 ”میرے خدا۔۔۔۔۔!“ سعید باہر منہ کھول کر رک گیا۔
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ متعلقہ کلرک کی غلطی ہے کہ اس نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ آپ خود

کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ مرد بڑے کتے ہوتے ہیں۔ کبھی تمہارے لئے ٹھنڈی سانس
 بھریں گے۔۔۔۔۔ روئیں گے۔ گڑگڑائیں گے اور کبھی اس طرح منہ پھیر لیں گے جیسے۔۔۔۔۔ میں کیا
 کہوں۔۔۔۔۔ سعید باہر اور میں گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے لیکن میں
 اُس سے چھپ کر ملتی تھی۔ کیونکہ افریقہ کے انگریز بہت متعصب ہیں۔ وہ کالوں سے نفرت
 کرتے ہیں حالانکہ سعید باہر بہتیرے انگریزوں سے بھی زیادہ حسین ہے مگر اس کا تعلق کالی نسل
 سے ہے۔ اور اب میں کہتی ہوں کہ افریقہ کے انگریز اپنے تعصب میں حق بجانب ہیں۔ سعید
 باہر مجھے یہاں اپنی سیکرٹری بنا کر لایا تھا اور اب یہاں آکر ایک نئی مصیبت میں پھنسا دیا۔
 مقصد میں نہیں جانتی کہ کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارا ایک تفریحی سفر تھا۔ ویسے وہ اپنے کسی بھائی سے
 بھی ملنا چاہتا تھا۔“

”سعید کے آدمیوں کو تو اس کا علم ہوگا کہ تم اس کی سیکرٹری کی حیثیت سے سفر کرنے
 والی ہو۔“

”کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو بھی اس کا علم نہیں۔ میرے عزیز اور دوست بھی سمجھتے ہیں کہ میرا
 سفر مومبارہ ہی تک محدود ہوگا۔ میں نے اُن سے یہی کہا تھا کہ میں تین ماہ مومبارہ میں قیام
 کروں گی۔“

”یہی وجہ ہے کہ سعید باہر۔۔۔۔۔!“ حمید جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی خاموش ہو گیا۔
 ”ہاں! ہاں۔۔۔۔۔ کہئے۔۔۔۔۔ سچی بات ہر حال میں کہہ دینی چاہئے۔ آپ کی زبان رک کیوں
 گئی۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ اسی لئے سعید اور زیادہ صفائی سے جھوٹ بول رہا ہے۔“
 ”خدا جانے۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ آپ مجھے اس قید سے رہائی نہیں دلا سکتے۔ میں اچھی خاصی قیدی ہوں۔ ناظم
 الامور کے دفتر سے سعید کو ہدایت ملی ہے کہ انکوائری کے دوران میں وہ مجھے اپنی نگرانی میں
 رکھے۔ مگر نگرانی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں کہیں قید کر دی جاؤں۔ سعید کے علاوہ میں اور کسی
 کو یہاں نہیں جانتی۔ مگر تازہ ہوا اور کھلے آسمان پر تو ہر آدمی کا حق ہوتا ہے۔ ان دیواروں میں
 میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مرجاؤں گی۔“

سوچ سکتے ہیں کہ سیکشن کی کتنی بدنامی ہوگی۔“

”یقیناً..... یقیناً!“

”بس یہی چکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج سے میں اس لڑکی کو چکر دینا شروع کر دوں اس طرح کام نہیں بنے گا۔ لہذا میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

سعید بابر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر ٹھکر آمیز لہجے میں بولا۔ ”ناظم الامور کی دفتر سے.....!“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ کی نگرانی میں ہے، مگر آپ یہ نہ بھولے کہ یہاں کے محکمہ سراغ رسانی کے ساتھ بھی فراڈ کیا گیا ہے۔“

”آپ جو مناسب سمجھیں کہجئے.....!“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ”لیکن مجھے میری لسنی براؤن ضرور ملنی چاہئے، ورنہ میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔ بھائی سے تو ہاتھ دھو چکا..... پتہ نہیں کیا چکے ہیں۔“

”مجرم بہت جلد سزا کو پہنچیں گے۔“ حمید نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت آمیز انداز میں کہا۔ ”جس کام میں کرنل فریدی کا ہاتھ پڑ جائے اس کا بیڑا پار ہی سمجھئے۔“

جب حمید لڑکی کو ساتھ لے کر چلے گا تو سعید بابر نے اردو میں کہا۔ ”بہت محتاط رہئے گا کپتان صاحب۔“

”مجھے سے زیادہ محتاط آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔“ حمید ہاتھ ہلا کر بولا اور وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

”وہ آپ کا کہنا مان گیا۔“ لڑکی نے کہا۔

”میں ایک ذمہ دار آفیسر ہوں۔ اس لئے اس وقت تمہیں یہاں کی ایک بہترین تفریح گاہ میں لے جاؤں گا۔“

”اوہ..... آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”تو سعید بابر نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”یقیناً..... مگر اس کا مقصد میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔ ہم دونوں ابھی تک محض دوست

رہے ہیں۔ میں بھی اسے صرف اسی حد تک پسند کرتی ہوں۔ ہماری شادی کا بھی کوئی امکان نہیں رہا ہے۔ پھر اس کی اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“

”تم اس کے اس بھائی کے متعلق کیا جانتی ہو جس سے ملنے کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔“

”کچھ بھی نہیں جانتی۔ اس نے بس یونیورسٹی میں اس کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ بھی محض اس لئے کہ وہ اس سے بہت مشابہ تھا۔“

”تم دونوں نے ساتھ ہی اپنی آمد یہاں درج کرائی تھی۔“

”ہاں! ہم دونوں ساتھ گئے تھے۔“

اسکے بعد حمید نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اس کے قریب ہی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اسکے جسم سے اٹھنے والی یونٹ کی بھنی بھنی خوشبو حمید کے ذہن پر بُری طرح مسلط ہو گئی تھی۔ وہ بیداری میں خواب دیکھنے لگا تھا۔ ویسے اسے اس کا ہوش تھا کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔

کار ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں رکی، وہ دونوں ہال میں جانے سے پہلے فیجر کے کمرے میں گھس گئے۔ فیجر کمرے ہی میں موجود تھا۔ حمید کو دیکھ کر بڑے ادب سے کھڑا ہو گیا۔

”کرنل صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور لڑکی کو گھورنے لگا۔

”کہاں تشریف رکھتے ہیں۔“ حمید بوکھلا گیا۔

”ہال ہیں..... ہو سکتا ہے انہیں علم ہو گیا ہو کہ آپ ایک سروگزار شباب کے ساتھ یہاں قدم رنج فرمائیں گے۔“

”شٹ اپ.....!“ حمید جھنجھلا گیا۔

”ارے نہیں کپتان صاحب۔“

دل بہت بلبل شیدا کا ہے نازک گلچیں
پھول گلزار میں یوں توڑ کہ آواز نہ ہو

”فرنیچر ٹوٹنے کی آواز پسند کرو گے۔“ حمید آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”اررر..... دیکھئے..... بس دور ہی رہئے گا۔ بقول شاعر..... جی ہاں..... سراپا ناز آپ

کے ساتھ ہے اور آپ مجھ سے دھول دھپا کرنے چلے ہیں۔“

حمید رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فریدی یہاں کیوں آیا۔ بھلا فریدی کو کسی

نائب کلب سے کیا سروکار۔

”میں فی الحال یہیں بیٹھوں گا۔“ حمید نے اس سے کہا۔ ”جب فریدی صاحب چلے جائیں تو مجھے اطلاع دینا۔“

”گویا میں وہاں جا کر یہ دیکھتا رہوں کہ وہ کب تشریف لے گئے۔“

”ہاں.....!“

”کیا آپ مجھے کوئی گرا پڑا آدمی سمجھتے ہیں۔“ میجر نے انکر انگریزی میں کہا۔

”اگر تم نے انگریزی میں اپنی قابلیت کا اظہار کیا تو تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔“

”آپ مجھے دھمکا رہے ہیں۔“

”تم بیٹھ جاؤ۔“ حمید نے لڑکی کی طرف مڑ کر کہا۔ مگر لڑکی غائب تھی۔ حمید دروازے کی طرف چھپتا۔ مگر وہ برآمدے میں بھی نظر نہیں آئی۔ حمید ہال کی طرف دوڑا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ ریکریشن ہال میں بھی دیکھا لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ پھر اُسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اُسے حقیقتاً کپاؤنڈ کی طرف جانا چاہئے تھا۔ اگر لڑکی اسے جل دے کر نکل گئی تھی تو ہال میں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ حالانکہ اب یہ فضول ہی تھا لیکن پھر بھی اُس کے قدم کپاؤنڈ کی طرف اٹھ گئے۔ وہ پھانگ والی روش طے کر رہا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ حمید جھنجھلا کر پلٹا۔

”کیوں پریشان ہو۔“ اُس نے فریدی کی آواز سنی۔

حمید خاموش ہی رہا۔ جواب کیا دیتا۔

”لڑکی کے غائب ہو جانے کا غم ہے۔“ فریدی چڑھانے کے سے انداز میں بولا۔

”اوہ..... تو یہ آپ تھے۔“ حمید چونک کر بولا۔

”بکواس مت کرو۔“ فریدی بگڑ گیا۔ ”تم اُسے لائے کیوں تھے؟“

”مجھے توقع تھی کہ میں اس سے کچھ معلوم کر سکوں گا۔“

”کیا معلوم کیا۔“

”یہی کہ کوئی خوبصورت لڑکی دیر تک نہیں ٹھہرتی۔“

”تم نے میری ساری اسکیم چوٹ کر دی۔“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”پھر کوئی دوسری اسکیم بن جائے گی۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ کو اس کا علم کیسے ہوا۔“

”میں یہیں موجود تھا..... پھر مجھے کیسے علم نہ ہوتا۔“

”تو آپ نے اُسے نکل کیوں جانے دیا.....!“

”محض اس لئے کہ تم اپنا وقت نہ برباد کرو۔“

”میں سعید باہر کو کیا جواب دوں گا۔“

”اُسے جواب دینا تمہارے فرائض میں نہیں۔ تم اپنے روزنامے میں نہایت اطمینان سے لکھ سکتے ہو کہ تم پوچھ گچھ کرنے کے لئے اُسے اپنے ساتھ آفس لارہے تھے، ایک جگہ کار روک کر تم کسی کام سے اترے جب کار کی طرف واپس ہوئے تو وہ غائب تھی۔“

”آ خر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہاں میجر داراب موجود ہے۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں ہیں ان میں سے ایک کے ساتھ تم رقص کرو گے۔“

”میں شاید ناچنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہوں۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”میں میجر داراب کو نہیں پہچانتا۔“

”میں بتاؤں گا۔“ فریدی اس کا ہاتھ پکڑ کر ہال کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”مگر وہ لڑکی۔“

”اُسے جہنم میں جھونکو..... میجر داراب کے ساتھ دو لڑکیاں ہیں۔“

فریدی اُسے ہال کے صدر دروازے تک لایا۔

”وہ ادھر..... بڑی پینٹنگ کے نیچے والی میز پر..... وہی میجر داراب ہے۔ اس کے

قریب والی میز خالی ہے..... میں نے مخصوص کرائی ہے۔“

”کیا آپ کو علم تھا کہ میں یہاں آؤں گا۔“

”ہاں مجھے علم تھا اور یہ کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہیں جس کے متعلق سوچنے میں تم اپنا

وقت برباد کرو۔ آج صبح تم نے ریش سے کہا تھا کہ تم تسلی براؤن کو یہاں رقص میں لانے کی

کوشش کرو گے..... بس اب جاؤ۔“

فریدی برآمدے سے کپاؤ ٹر میں اتر گیا۔ حمید پر اب بھی اسی لڑکی کی گمشدگی کی فکر سوار تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ اس طرح اور اتنی جلدی غائب کہاں ہو گئی۔ اب وہ پھر نیجر کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ نیجر نے اُسے دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ حمید نے اس بار اُس سے کوئی بُرا برتاؤ نہیں کیا۔

”کیا تم نے اُسے کمرے سے نکلنے دیکھا تھا۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”پرواہ نہ کیجئے پکتان صاحب۔ یہ سنگدل ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

دیکھیں محشر میں اُن سے کیا ٹھہرے

تھے وہی بت وہی خدا ٹھہرے

”میں شعر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میری بات کا جواب دو۔“

”جی ہاں..... میں نے اُسے باہر جاتے دیکھا تھا۔ ایک لڑکی نے اشارے سے اُسے بلایا تھا۔“

”لڑکی نے.....!“

”جی ہاں..... آپ مطمئن رہئے۔ وہ کوئی مرد نہیں تھا۔“ نیجر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

حمید مزید کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اُس نے نیجر کے قہقہے کی آواز سنی۔

لیکن وہ اس وقت اس سے الجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

وہ ہال میں آیا اور سیدھا اُس خالی میز کی طرف چلا گیا جو فریدی نے غالباً اسی کے لئے

مخصوص کرائی تھی۔ میجر داراب خاموش بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ تھی دو لڑکیاں آپس میں اونچی

آواز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ میجر داراب ایک دبلا پتلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ گال چپکے ہوئے تھے

اور آنکھیں اندر کودھنی ہوئی تھیں۔ سر طبیعت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ایسا ہو رہا تھا جیسے اُسے

ان لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ شاید وہ ان کی گفتگو بھی نہیں سن رہا تھا۔

حمید نے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک طویل سانس لی اور سکیوں کی

طرح بڑبڑاتا ہوا چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں لڑکیاں سفید فام اور قبول صورت تھیں۔

اچانک ایک ویٹر میجر داراب کی میز کے قریب آ کر نہایت ادب سے جھکا اور آہستہ آہستہ کچھ

کہنے لگا۔ لڑکیاں خاموش ہو گئیں۔ حمید نے میجر داراب کو اٹھ کر جاتے دیکھا۔ وہ اُس دروازے سے

نیچر کی کمرے میں داخل ہو رہا تھا جو ہال میں کھلتا تھا ہو سکتا ہے کہ اُس کی کوئی ٹیلی فون کال رہی ہو۔

ابھی رقص شروع ہونے میں دیر تھی اور زیادہ تر لوگ ہال ہی میں تھے، کبھی کبھی ریکریشن

ہال کی طرف سے موسیقی کی ایک لہر آتی اور پھر سکوت طاری ہو جاتا۔ شاید آپریٹر مائیک سٹ

کر رہا تھا۔ حمید بہت مغموم نظر آ رہا تھا۔ لڑکیوں نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر گفتگو میں مشغول

ہو گئیں۔ اتنے میں وہی ویٹر آیا پھر ان کی میز کے قریب آ کر بولا۔ ”صاحب کسی ضروری کام

سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے لئے کہا ہے کہ آپ یہیں تشریف رکھیں گی۔“

”اوہ..... ٹھیک جاؤ۔“ ایک لڑکی بولی۔ پھر اُس نے دوسری کی طرف جھک کر آہستہ سے

کچھ کہا اور دونوں میساختہ فیس پڑیں۔ حمید نے بھی قہقہہ لگایا اور جیسے ہی لڑکیوں نے اُس کی

طرف دیکھا اُس نے گویا اپنے قہقہے میں بریک سالگا دیا اور کچھ پشیمان سا بھی نظر آنے لگا۔

لڑکیاں چند لمحے اُسے غصیلی نظروں سے دیکھتی رہیں، پھر انہوں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

حمید بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھا اور ان کی میز کے قریب جا کر بولا۔ ”میں معافی چاہتا

ہوں۔“

لڑکیوں نے پھر اُسے گھور کر دیکھا اور حمید ہکھلایا۔ ”ایک بیوقوف آدمی سمجھ کر معاف

کر دیجئے۔ میں دوسروں کو ہنسنے دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگتا ہوں۔ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں فوراً

معاف کر دیتے ہیں۔“

”تم ایسے ہو..... اسی لئے اپنی میز پر تنہا نظر آرہے ہو۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”نہیں اس کی وجہ تو دوسری ہے۔“ حمید ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

ایک لڑکی کی آنکھوں میں احتجاج تھا لیکن دوسری بدستور مسکراتی رہی بلکہ حمید نے بھی یہ

دیکھا کہ اُس نے اس لڑکی کو آنکھ ماری تھی۔

”تم شاید شیریں پیتی ہو۔“ اس نے دوسری لڑکی سے کہا۔ ایک لمحہ خاموشی رہی پھر بولی۔

”میں پورٹ پیتی ہوں۔“

حمید نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر پورٹ اور شیریں کے لئے کہا اور اپنے لئے کافی منگوا۔

ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی بولی۔ ”واہ..... تم کافی پیو گے۔ نہیں یہ غلط ہے۔ ویٹر! لارج واسکی اور

سوڈایا جو یہ پسند کریں۔

”لارج و ہسکی اور سوڈا۔“ حمید ششی میں آکر بولا۔ اس نے سوچا ایک آدھ پگ میں کیا بگڑے گا۔ انکار کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکیاں اُسے بالکل ہی چھوڑ کر دھتکار دیں۔ اگر فریدی نہ کہتا تب بھی اُسے کم از کم ایک ساتھی کی ضرورت یقیناً محسوس ہوتی۔

مگر جب دور شروع ہوجائے تو معاملہ ایک ہی آدھ پگ تک محدود نہیں رہتا۔ لڑکیاں عادی معلوم ہوتی تھیں، مگر حمید اناڑی تھا۔ اس نے شاید زندگی میں دو ہی چار بار شراب پی تھی اور ہر موقع پر کھوپڑی سے باہر ہو گیا تھا۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا اور پھر کھوپڑی سے باہر ہونے کے بعد کہاں کی لڑکیاں اور کہاں کا رقص۔ حمید نے آگے پیچھے جھول کر کہا۔

”میں..... جھولا..... جھولوں گا.....!“

”پہلے بل ادا کر دو۔“ ایک لڑکی بولی۔

حمید نے جھلا کر جیب سے پرس نکالا اور اُسے میز پر پٹختا ہوا بولا۔ ”کیا غریب سمجھتی ہو مجھے..... میں..... لسل..... لسل..... لسل براؤن ہوں..... ہاں۔“

لڑکی نے پرس سے کچھ نوٹ نکال کر ویٹر کی لائی ہوئی ٹرے میں ڈال دیئے اور پرس پھر حمید کی جیب میں ٹھونس دیا اور اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ ہی گئیں۔

”ہائیں..... میں..... بھی..... میں بھی۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ مگر وہ اتنی دیر میں ہال سے نکل چکی تھیں۔ حمید نے قریب سے گزرنے والے ایک ویٹر کی گردن پکڑ لی۔

”جی صاحب۔“ ویٹر بوکھلا گیا۔ یہاں کے سارے ویٹر حمید کو پہچانتے تھے۔

”منبر کو بھیج دو..... میں شعر سننا چاہتا ہوں۔“

”اچھا صاحب.....!“

حمید نے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اُسے نہ لائے تو..... میں تمہیں جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

شامت اعمال کو منبر خود ہی کسی کام سے اُھر آ نکلا تھا۔ اُس نے حمید کو ویٹر کی گردن پکڑتے دیکھا اور قریب قریب دوڑتا ہوا اُس کی میز کی طرف آیا۔

سائے کی لاش

”یہ کیا کر رہے تھے آپ.....!“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔

”ہائے..... تم آگئے..... مری جان..... ہٹو..... ہٹو.....!“

”نہیں..... میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”تمہیں بیٹھنا پڑے گا۔“ حمید نے اسے جھنجھوڑ کر زبردستی بٹھا دیا۔

”ارے ارے..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... ہائیں۔“

”مجھے اشعار سناؤ..... میری جان.....!“ حمید جھک کر اُسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”میں اس وقت آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا..... آپ نشے میں ہیں۔“

”تم کتے کے پلے ہو..... مجھے شعر سناؤ۔“

”آپ میری تو ہین کر رہے ہیں۔“

حمید نے میز پر جھک کر اُسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا اور منبر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے آس پاس قہقہے ہی قہقہے تھے۔ ویسے چونکہ وہاں اونچے نیچے ہی طبقے کے لوگ آتے تھے، اس لئے ہڑ بولگ صرف اسی میز تک محدود رہی۔

ابھی یہ دھینگا مٹتی کسی فیصلہ کن منزل پر نہیں پہنچی تھی کہ میجر داراب آ گیا۔ یہ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا اور دہلا ہونے کی وجہ سے غیر معمولی طور پر دراز قد معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے انہیں حیرت سے دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر میز کے قریب پہنچ گیا۔

”یہ میز میرے لئے مخصوص تھی۔“ اس نے سرد لہجے میں منبر سے کہا۔

”اب آپ دیکھ رہے ہیں جناب میجر صاحب..... یہ نشے میں ہیں۔“ منبر ہانپتا ہوا بولا۔

”میں ان سے یہی کہنے آیا تھا کہ یہ میجر صاحب کی میز ہے۔“

”کون ہے۔“ میجر داراب نے حقارت سے پوچھا۔

”کیپٹن حمید.....!“

”یو شٹ اپ..... بل و دیو.....!“ حمید نے منبر کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”کیپٹن پلیز..... میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ.....!“ داراب غرایا۔

”خاموش رہو، کچھوے..... ورنہ میں تمہیں یہیں دفن کر دوں گا۔“ حمید تن کر کھڑا ہو گیا۔

”دیکھا میجر صاحب۔“ میجر اچھل کر ایک طرف ہٹا ہوا بولا۔ ”دیکھا آپ نے..... ان حضرت نے کلب کو کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ زبردست ٹھہرے..... اب آپ سے بھی بدتمیزی فرما رہے ہیں۔ خدا ان پولیس والوں سے سب کو محفوظ رکھے..... آمین..... بقول شاعر.....!“

حمید اور داراب ایک دوسرے کو خوشخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔

اچانک داراب بڑی پھرتی سے جھکا اور حمید کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ اس کی یہ حرکت معجزے سے کم نہیں تھی۔ وہ بہت دبلا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت مردنی سی چھائی رہتی تھی۔ گال پٹکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کودھنی ہوئی تھیں۔ وہ کسی زندہ آدمی کا چہرہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی اس نے حمید جیسے قوی ہیکل آدمی کو اٹھالیا تھا اور حمید اس کی گرفت میں اس طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا جیسے کوئی ننھا سا بچہ کسی بڑے کی گود سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سفسان سرٹک

وہ اُسے اسی طرح اٹھائے ہوئے چلتا رہا۔ ہال قہتہوں سے گونج رہا تھا اور حمید کا نشہ..... وہ تو کبھی کاہرن ہو چکا تھا۔

میجر داراب نے برآمدے میں پہنچ کر آہستہ سے اُسے اتار دیا۔

”اب تم گھر جا سکتے ہو.....!“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر کھوپڑی پر کنٹرول نہیں رہتا تو پتہ کیوں ہو۔“

حمید کی مٹھیاں بھیج گئیں لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی اقدام کرتا، میجر داراب ایڑیوں پر گھوما اور ہال میں چلا گیا۔ وہاں بھی نشے کی ترنگ میں تھے اس لئے کسی نے بھی یہاں تک آنے کی زحمت نہیں گوارا کی تھی۔ بس اپنی جگہوں پر بیٹھے ہنستے رہ گئے تھے۔

حمید آہستہ آہستہ میجر کے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ سارا سر در رخصت ہو گیا تھا۔ ایسی بے عزتی سے کبھی اس کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ خبر پر لگا

کر سارے شہر میں اڑتی پھرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اخبارات بھی زہر اگلیں۔ انہیں تو بس پولیس افسروں کے خلاف کچھ لکھنے کا بہانہ مل جانا چاہئے۔

وہ میجر کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ ایک آرام کرسی میں گر گیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں تھیں اور آنکھیں سرخ۔ سانس چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ تقریباً ایک منٹ تک اسی طرح پڑا رہا تھا، پھر اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میجر کے کمرے میں داخل ہوا لیکن وہ دروازے ہی کے قریب رک گیا تھا۔

اچانک وہ شور مچانے والے انداز میں کہنے لگا۔ ”زیادتی آپ ہی نے کی تھی جناب! آج آپ نے میری بہت بے عزتی کی ہے۔ میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔“

حمید سیدھا بیٹھتا ہوا بولا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

میجر ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے حمید سے اس رویہ کی توقع نہیں تھی۔ شاید وہ سمجھا تھا کہ حمید میجر داراب کا غصہ اس پر اتارے گا۔

”دیکھئے نا پکتان صاحب۔“ وہ آگے بڑھ کر ناصحانہ انداز میں کہنے لگا۔ ”آپ ایک بہت بڑی پوزیشن کے مالک ہیں۔ آپ کو ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہئے آپ بعض اوقات عام آدمیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ میجر کہتا رہا۔ ”اب آپ خود سوچئے..... اس وقت یہ بات کہاں تک پھیلے گی۔“

”ہاں..... آں..... تم اپنا کام کرو۔“ حمید نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”میں تھوڑی دیر تک بیٹھوں گا۔“

”آپ زندگی بھر یہیں بیٹھے..... مجھے خوشی ہوگی۔ مگر آپ کی رسوائی مجھے بھی گراں گزرے گی۔ میں اتنی قدر کرتا ہوں آپ کی۔“

”اب یہ گراموفون بند کرو..... یا باہر چلے جاؤ۔“ حمید غرایا۔

میجر چپ چاپ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میجر نے ریسیور اٹھالیا۔

پھر حمید کی طرف بڑھ کر بولا۔ ”آپ کا فون ہے۔“

”ہیلو..... حمید اسپیکنگ.....!“ حمید نے ریسیور لے کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

ٹنڈی ہوا لگتے ہی حمید کی پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ اُس نے پائپ میں تمباکو بھری، اور پست گاہ سے ٹیک لگا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی نے اسے میجر داراب کے پیچھے کیوں لگایا تھا۔ اتنا اُسے معلوم ہوا تھا کہ سعید باہر نے اپنے ہم شکل بھائی کے سلسلے میں داراب کا تذکرہ کیا تھا۔ اُس کے پہلے ڈرافٹ پر میجر داراب ہی نے تصدیق کی تھی اور الائیڈ بینک میں اس کا اکاؤنٹ بھی اسی کی سفارش پر کھولا گیا تھا۔ مگر کم از کم داراب کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ تین ہزار روپے ماہوار پر اپنی نیت خراب کر بیٹھتا۔ وہ لاکھوں میں بھی نہیں کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ اس کے لئے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی رقم اتنی کشش نہیں رکھتی تھی کہ وہ اس کے لئے ایسی پر اسرار وارداتیں کرتا۔ فریدی نے تو اس کی لڑکیوں میں سے ایک کے ساتھ رقص کرنے کو کہا تھا۔ مقصد کچھ بھی رہا ہو۔ حمید کو سب سی زیادہ حیرت اُس لاش نما آدمی کی طاقت پر تھی۔ اُس نے اُسے پھول کی طرح اٹھالیا تھا۔

حمید کو ایک بار پھر اُس پر غصہ آ گیا اور اُس نے ایک بہت بڑی قسم کھائی کہ وہ اُس سے اپنی اس توہین کا بدلہ ضرور لے گا۔

حمید نے ٹیکسی کپاؤنڈ میں لے جانے کے بجائے پھانک ہی پر رکوا دی۔ کیونکہ قاسم پھانک ہی پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے ساتھ سلیمہ بھی تھی۔

”میں یہیں تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“ قاسم نے کہا۔ ”گھر میں گھپلا ہو جائے گا۔“

”کیا بات ہے۔“

”یہ سالانہ سعید باہر..... مصیبت ہو گیا ہے۔“ اور سلیمہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں..... یہ آدمی مجھے خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کیوں میں ایسا محسوس کرتی ہوں وہ بظاہر بڑا خوش اخلاق ہے، مگر کوئی چیز..... نہ جانے کیا چیز ہے اس میں..... جس کی بناء پر اُس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔“

”مگر وہ تم لوگوں کے لئے کیوں مصیبت ہو گیا ہے۔“

”میں نہیں پسند کرتا۔“

”کیا نہیں پسند کرتے۔“

”اب مجھے اپنی شکل نہ دکھانا سمجھے۔“ دوسری طرف سے فریدی کی غصیلی آواز آئی۔

”بہت بہتر.....! حمید نے جھلا کر کہا اور ریسور کو کریڈل پر شیخ کر پھر اسی کرسی میں آگرا۔ شراب کا اثر تو ابھی باقی ہی تھا۔ دماغ میں گرمی تھی۔ خون جوش کھا رہا تھا۔ اُسے فریدی پر غصہ آ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ کل ہی اپنی پہلی فرصت میں استعفیٰ دے دے گا۔ مگر یہ رات کہاں بسر ہوگی..... اُس نے سوچا۔ کیوں نہ قاسم ہی کے گھر چلا جائے۔

یہ سوچ کر وہ باہر نکلا۔ اس وقت دوبارہ ہال میں واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ بے خیالی میں وہ اس طرف چل پڑا جہاں کار کھڑی کی تھی۔ مگر کار وہاں موجود نہیں تھی۔ شاید فریدی اُسے لے گیا تھا۔ وہ کپاؤنڈ سے باہر نکلا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک دو فروش کی دوکان سے قاسم کو فون کر رہا تھا۔

”ہیلو.....!“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”میں حمید ہوں..... قاسم ہے گھر پر۔“

”میں سلیمہ ہوں..... کہئے حضرت خوب غائب ہوئے۔“

”بہت مشغول تھا۔ ذرا قاسم کو فون پر بلائیے۔“

”ٹھہریئے..... ایک منٹ.....!“

حمید انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ ”واؤں..... وائوں..... ہالو..... وائوں.....“

وائوں..... میں خانا..... خار ہا ہوں..... ہالو.....!“

”قاسم.....!“ حمید نے کہا۔ ”میں رات تمہارے یہاں بسر کرنے آ رہا ہوں۔“

”ہائیں..... وائوں..... وائوں..... قیا مطالب.....!“

”بس یونہی..... گھر نہیں جانا چاہتا۔“

”ہا چھا..... آ جاؤ..... آ جاؤ..... وائوں..... وائوں..... آ ہا ضارور آ جاؤ..... تم سے ایک

ضاروری بات کرنی ہائے..... وائوں..... وائوں.....“

حمید نے ریسور رکھ دیا۔ باہر آ کر ایک ٹیکسی کی اور قاسم کی کوشی کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور آج ہوا بھی بہت تیز تھی۔ شراب کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا تھا۔

”اُس کی اور راحلہ کی دوستی..... وہ دن میں لگی بار آتا ہے۔ دونوں میں سرپوشیاں ہوتی رہتی ہیں۔“

”سرپوشیاں..... کیا.....!“

”سرپوشیاں نہیں جانتے۔“ قاسم نے قہقہہ لگایا۔ ”بڑے قابل بننے ہو، کان پکڑو بتا دوں۔“
حمید نے ہاتھ بڑھا کر قاسم کا کان پکڑ لیا اور قاسم مسکرا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے..... سرپوشیاں..... وہی آہستہ آہستہ باتیں کرنا۔“

سلیمہ بے تحاشہ ہنس پڑی۔

”اے سرگوشیاں..... لم ڈھگ.....!“

”ہائیں..... تم نے میرا کان پکڑ رکھا ہے۔“ قاسم اس کا ہاتھ جھٹکتا ہوا بولا۔ ”دھوکے باز..... میں نے تم سے اپنا کان پکڑنے کو کہا تھا۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ پھر وہ سلیمہ سے بولا۔ ”کیا آپ کو بھی اُن دونوں کا ملنا ناگوار ہے۔“

”میں نے صرف یہ کہا تھا کہ باہر جو کچھ بھی نظر آتا ہے، حقیقتاً وہ نہیں ہے۔“

”آپ کے پاس کوئی ثبوت بھی ہے..... یا یہ محض قیاس ہے۔“

”میں محسوس کرتی ہوں۔“

”ان سے زیادہ میں محسوس کرتا ہوں۔“ قاسم بولا۔ ”اس سالے کو مرغا بنانا چاہئے۔ تم نے دیکھا نہیں وہ کتنا کمینہ..... اُس بیچاری پللی براؤن کو ساتھ لایا اور یہاں آ کر کہہ دیا کہ میں تو اُسے پہچانتا ہی نہیں۔“

”طلسی براؤن.....“ حمید نے ہنسنے کی۔

”میرے ٹھیکے سے وہ کوئی براؤن ہو۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔“

دفعتاً حمید کو خیال آیا کہ اُسے لسلی براؤن کے متعلق سعید باہر کو فون کرنا چاہئے۔ اُس نے قاسم سے کہا کہ وہ سعید باہر کو فون کرنا چاہتا ہے۔ قاسم کے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ خود سعید باہر کو ٹھیک کرنے کے چکر میں ہے۔ قاسم کی چھت کے نیچے رات بسر کرنے کے لئے یہ

نردی تھا کہ وہ قاسم کی ہاں میں ہاں ملائے۔

قاسم نے مزید سوالات نہیں کئے۔ وہ تھوڑی دیر بعد ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ سلیمہ حمید کیساتھ ہی رہی۔ ساتھ ہی وہ دونوں اُس کمرے میں آئے جہاں فون تھا۔ اُس نے سعید باہر کے نمبر ڈائل کئے، وہ گھر ہی پر موجود تھا۔ اُس نے اُسے وہ بُری خبر سنائی اور سعید باہر گرجنے لگا۔ ”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا..... اب بتائیے! میں ناظم الامور کے دفتر کو کیا جواب دوں گا۔“

”آپ نہایت اطمینان سے اس کا سارا بار یہاں کے حکمہ سراغ رسانی پر ڈال سکتے ہیں۔“

فنا ہے کہ یہاں کے حکمہ سراغ رسانی کے ساتھ بھی فراڈ کیا گیا ہے..... لہذا.....!“

”سب جہنم میں جائے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”طلسی مجھے واپس ملنی چاہئے۔ وہ لسلی براؤن جو میرے ساتھ آئی ہے۔“

”آپ پرواہ نہ کیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”اس کا اس طرح غائب ہو جانا آپ کے حق میں بہت اچھا ہوا ہے۔“

”میرے حق میں کیا اچھا ہوا ہے۔“ سعید غریبا۔

”حکمہ سراغ رسانی آپ کے معاملے میں پوری طرح دلچسپی لینے لگے گا۔ ویسے اُسے اس فقیر سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی جو آپ کا ہم شکل تھا۔ آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت تو نہیں کہ وہ آپ کا بھائی ہی تھا۔“

”دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔“ حمید نے کہا۔ ”ہیلو.....!“

”ہائیں.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میری وہ

رپورٹ کہ میری زندگی یہاں خطرے میں ہے۔ اس کے لئے آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔“

”بہت کچھ کر رہے ہیں آپ مطمئن رہئے۔“ حمید نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر ریسپورر رکھ دیا۔

سلیمہ نے پوچھا۔ ”کیا وہ لڑکی آپ کے ساتھ تھی۔“

”ہاں..... میں اُسے ہیڈ کوارٹر لے جا رہا تھا..... راستے میں وہ دھوکا دے کر نکل گئی۔“

”یہ لسلی براؤن والا واقعہ کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔“

”یہ بہت ضروری ہے تنہا گئے بغیر اُس آدمی کو تلاش کر لینا آسان کام نہ ہوگا۔ میں دراصل ابھی تک اُن نشانات کو نہیں سمجھ سکا جو سعید بابر کی کپاؤنڈ میں ملے تھے۔ وہ کسی جانور کے پیر کا نشان تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے مگر اُسے کسی آدمی کے پیر کا نشان سمجھنے میں بھی دشواری پیش آئے گی۔ اُسے کسی آدمی کے پیر کا نشان سمجھنے میں مجھے تامل ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ نشان محض دھوکا ہی ہو۔ میں نے آپ ہی کے کسی کیس میں پرندوں کے بچوں کے نشانات کے متعلق پڑھا تھا۔ مگر وہ جوتوں کے تلے میں لگے ہوئے خاص قسم کے نطوں کے نشانات ثابت ہوئے تھے۔“

”ہو سکتا ہے..... یہی بات ہو۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ کسی جوتے کے سول کے نشانات بھی ہو سکتے ہیں مگر اتنے چوڑے جوتے بھی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ انگلیوں کے نیچے کے ابھار کی چوڑائی تقریباً سات انچ تھی۔ چلو میں یہ بھی مانے لیتا ہوں کہ وہ اتنے ہی چھوڑے جوتے ہو گئے، لیکن پہننے والے کے نیچے اتنے چوڑے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ جب نیچے اتنے چوڑے نہیں ہو سکتے تو پورے سول پر یکساں دباؤ ہرگز نہیں پڑ سکتا۔ جب یکساں دباؤ نہیں پڑ سکتا تو نشان کے بعض حصے یقیناً غیر واضح ہو گئے۔ مگر ہمیں ایک نشان بھی ایسا نہیں ملا جس کا کوئی حصہ غیر واضح ہوتا۔“

ریکا چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ”مگر آپ بالی کمپ میں اس کے متعلق.....!“

”ہاں..... میں اسی کے متعلق وہاں معلومات فراہم کرنے کی توقع رکھتا ہوں۔ تمہیں چڑھائی والے ہوٹل میں چھوڑ دوں گا۔“

”مگر آج حمید صاحب کہاں ہیں۔“

”وہ ایک دوسرا کام انجام دے رہا ہے۔“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

لہجے کی تلخی ریکھا نے محسوس کر لی اور اس قسم کے سوالات کرنے لگی جن کے جواب ہی سے وہ اس تلخی کی تہہ تک پہنچ جائے لیکن فریدی سے کچھ معلوم کر لینا آسان کام نہیں تھا۔ حمید والے واقعے کی تشہیر نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا کہ اس کی خبر اخبارات میں نہ آنے پائے۔ ریکھا کے سوالات کے جواب ایسے نہیں تھے جن سے وہ واقعات کا اندازہ کر سکتی۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔

”اپنے لئے کچھ بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔ ”میری زندگی کا حیرت انگیز دن وہ ہوگا جب کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔“

”مگر اُس دن آپ مغموم بھی ہوں گے۔“ سلیمہ بولی۔ ”کیونکہ کوئی زندہ لڑکی تو آپ سے شادی کرنے سے رہی۔“

”میرے لئے یہ موضوع بہت زیادہ المناک ہے۔ اس لئے اسے یہیں ختم کر دو۔“



فریدی کی کار تار کی کا سینہ چیرتی ہوئی سنسان سڑک پر تیرتی رہی۔ لیڈی انسپکٹر ریکھا اُس کے برابر بیٹھی ہوئی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ رہی تھی۔ اُس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے اور پھر بند کر لئے۔ فریدی کی نظر وڈ شیلڈ پر تھی۔ اچانک وہ بولا۔

”ہماری یہ ہم خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے میں تمہیں ساتھ لانے سے احتراز کر رہا تھا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے..... اس کی تمام تر ذمہ داری خود مجھ پر ہے۔ آپ بتائیے کیا صرف فائلوں میں سرکھپانے سے میں آگے بڑھ سکوں گی۔“

”اگر تم صرف تعاقب کرنے کے آرٹ پر زور دو تب بھی تمہارا مستقبل محفوظ ہی ہوگا۔ میں اس وقت جس مہم پر جا رہا ہوں، وہ کم از کم کسی عورت کے بس کی نہیں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں۔“

”بالی کمپ..... وہاں ایک آدمی رہتا ہے جس تک پہنچنے کے لئے کافی دشواریوں کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑی سی ورزش بھی کرنی پڑے۔ ورزش کا مطلب غالباً تم سمجھتی ہی ہوگی۔ نہیں میں تمہیں وہاں تک ہرگز نہیں لے جاؤں گا۔ تم چڑھائی والے ہوٹل میں میرے فون کا انتظار کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں فون کرنے کی ضرورت محسوس کروں۔ ہو سکتا ہے کہ بات بڑھ جائے اور بالی کمپ کے تھانے سے مدد طلب کرنی پڑے۔ یہ کام تم وقت پر انجام دے سکو گی۔“

”اگر وہ ایسی ہی خطرناک جگہ ہے تو آپ وہاں تنہا کیوں جائیں۔“

”اچانک کار کی داہنی سمت سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نکلی اور ٹھیک کار کے سامنے دوڑنے لگی۔ کار سے اس کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ دس گز رہا ہوگا۔ فریدی نے چاہا کہ اپنی کار داہنی طرف سے آگے لے جائے لیکن اس کی کار کی ہیڈ لائٹس کا ڈائریکشن بدلتے ہی موٹر سائیکل اب بھی سامنے ہی تھی۔ فریدی نے بائیں جانب سے ٹکنا چاہا لیکن اس بار بھی وہی واقعہ پیش آیا۔

”بالکل گدھا ہے کیا.....!“ ریکھا بڑبڑائی۔

”نہیں شاید میں گدھا بننے والا ہوں۔ ٹارچ اور ریوالمور سنبھالنا۔“

”خطرہ.....!“ ریکھا بڑبڑائی۔

”یقیناً..... اب اس کی رفتار بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ یا تو مجھے رفتار کم کرنی پڑے گی یا کار روکنی پڑے گی۔“

پھر فریدی نے عقب نما آئینے کی طرف دیکھا مگر پیچھے سڑک سنسان پڑی تھی۔ نزدیک یا دور کہیں بھی کسی کار کی ہیڈ لائٹس نہیں دکھائی دے رہی تھیں۔

”کیا قصہ ہے۔“ فریدی بڑبڑایا۔

”کیا میں اس کے پچھلے پہنچے پر فائر کروں۔“ ریکھا نے پوچھا۔

”نہیں..... یہ کام میں ہی کروں گا۔“

”کیسے..... کیجئے گا۔“

”دیکھو! بتاتا ہوں..... مگر خطرہ..... میں ایک بار اُسے متنبہ کر دوں۔“

پھر فریدی نے چیخ کر کہا۔ ”اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو اب کار میرے قابو سے نکلتی ہے۔“ لیکن موٹر سائیکل سواری کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر فریدی نے جھلا کر رفتار بڑھائی لیکن موٹر سائیکل والا بھی غافل نہیں تھا۔ ساتھ ہی موٹر سائیکل کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔

اب بھی دونوں کے درمیان پہلے ہی کا سا فاصلہ تھا۔

فریدی نے کوٹ کی جب سے ریوالمور نکالا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا۔ ریوالمور کو گود میں ڈال کر داہنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ گرانے لگا اور ریکھا کانپ گئی۔ اس کی سمجھ میں

ہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح فائر کرے گا۔ ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر ہوگا دوسرے سے وہ فائر کرے گا۔ اس کے لئے اُسے کھڑکی کی طرف اتنا جھکنا پڑے گا کہ اسٹیرنگ والا ہاتھ بہک بھی سکتا ہے۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں کیونکہ فریدی نے روانگی کے وقت ہی اس مہم کے خطرناک ہو جانے کے امکانات ظاہر کئے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ ریکھا اُس کے ساتھ نہ جائے۔

فریدی نے ریوالمور والا ہاتھ کھڑکی کے باہر نکالا۔ موٹر سائیکل، سوار سمیت کار کی اگلی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ فریدی کھڑکی کی طرف جھکا۔ مگر ریکھا کی نظر اسٹیرنگ پر رکھے ہوئے ہاتھ پر تھی۔ اچانک فریدی کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ریکھا کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔ فریدی نے پورے بریک لگائے تھے۔ موٹر سائیکل فرار سے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ فریدی کا داہنا ہاتھ اب بھی کھڑکی کے باہر ہی تھا اور وہ کسی چیز کو باہر طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”انجن بند کر دو.....!“ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ریکھا بوکھلا گئی۔ کار کے اندر اندھیرا تھا۔ بہر حال اُس نے بڑی پھرتی سے انجن بند کیا۔

”روشنی.....!“ فریدی نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ ریکھا کی ٹارچ اس کے زانو کے قریب ہی پڑی تھی۔ اُس نے کھڑکی میں اس کی روشنی ڈالی اور دوسرے ہی لمحے میں اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ فریدی کی داہنی کلائی ایک خوفناک کتے کے جڑوں میں تھی۔ فریدی نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر پر ایک گھونٹہ رسید کیا اور وہ غراتا ہوا دوسری طرف پلٹ گیا۔ اس پر پوری طرح روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی طور پر دراز قد کتا تھا۔ رنگت سیاہ تھی۔ جسم کی بناوٹ گرے ہاؤنڈ کی سی تھی..... سر پر تین سفید دھاریاں تھیں۔ کتے نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی اور آدھے دھڑ سے کھڑکی میں گھس آیا۔ ریکھا پھر چیختی۔

اس بار فریدی نے اسے باہر دھکیل دیا۔

”تمہارا پستول..... ٹارچ جلاؤ۔“

ریکھا نے پھر ٹارچ روشن کی۔ بدقت تمام بلاؤز کے گریبان سے پستول نکالا۔ اس دوران میں فریدی نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ کتا اچھل اچھل کر اس پر پہنچے مار رہا تھا۔ فریدی

نے شیشے کو تقریباً ایک انچ نیچے کھسکایا اور پستول سے کتے پر فائر کر دیا۔ مگر اس نے یہ بھی دیکھا کہ کتا بڑی پھرتی سے خود کو بچا گیا۔ اُس نے دوسرا فائر کیا لیکن اس بار بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ تیسرے فائر پر کتے نے سڑک کے کنارے کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگادی۔ فریدی نے اسی سمت دو فائر اور کئے لیکن جھاڑیوں میں جنبش تک نہ ہوئی۔

پھر تقریباً دو یا تین منٹ تک وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

سارا جنگل جھینگروں کی جھانکیں جھانکیں سے گونج رہا تھا۔ کبھی کبھی گیدڑوں کی آوازیں بھی فضا میں ابھرتیں اور دور تک تیرتی چلی جاتیں۔

”ہمیں یہیں سے واپس ہونا چاہئے۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”میرا ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ مجھے فوراً انجکشن لینا چاہئے۔ کتا غیر معمولی تھا۔“

وہ نیچے اترا اور اپنا رویا لور اٹھا کر پھر کار میں آ بیٹھا۔ انجن اشارت کیا اور کار شہر کی طرف موڑنے لگا۔

”بڑا حیرت انگیز کتا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”انتہائی پھریتلا..... یقیناً بڑی محنت سے سدھایا گیا ہوگا۔ مگر میں نہیں جانتا کہ وہ کس نسل سے ہے۔“

”میں آپ کا ہاتھ دیکھوں۔“ ریکھا نے کہا۔

”پرواہ نہ کرو..... اس کے دانت ہڈیوں تک پہنچ گئے تھے۔ مگر آج تک میری نظروں سے ایسا تیز رفتار کتا نہیں گذرا گویا وہ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہا تھا۔ وہ موٹر سائیکل اسی لئے سامنے آئی تھی کہ میں کار روک دوں اور کتا مجھ پر حملہ کر دے۔“

”آپ کو تو اسی موٹر سائیکل والے کو گولی مارنی چاہئے تھی۔“

”یہ کیسے ممکن تھا۔ میں نے اسی لئے تمہیں فائر نہیں کرنے دیا تھا کہ کہیں تمہارا ہاتھ نہ بہک جائے۔ اس وقت تک ہمارے پاس اُسے گولی مارنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔“

”پتہ نہیں وہ مردود تھا کون۔“

”تم نے نہیں دیکھا کہ اس کے چہرے پر سیاہ نقاب تھی۔“

”میں نے نہیں دیکھا تھا ورنہ آپ مجھے اس پر فائر کرنے سے باز نہ رکھ سکتے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ ریکھا بھی تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر اُس نے کہا۔

”آپ کو کچھ اندازہ ہے..... وہ کون رہا ہوگا۔“

”خدا جانے..... میرے ایک نہیں ہزاروں دشمن ہیں مگر اس قسم کا کتا زندگی میں پہلی بار میری نظر سے گذرا ہے۔“

”آپ کی کلائی سے خون بہہ رہا ہوگا۔“ ریکھا نے مضطرب آواز میں کہا۔

”پرواہ نہ کرو..... میرا جسم خون بہانے کا عادی ہے۔ شاید ہی اس کا کوئی حصہ زخم کے نشان سے خالی ہو۔“

ریکھا نے ایک طویل سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر بعد فریدی نے کہا۔ ”مجھ پر غشی طاری ہو رہی ہے۔ تم ڈرائیو کرو۔ میں کچھلی

نشت پر جا رہا ہوں۔ شاید! میں شاید بیہوش ہو جاؤں گا۔ تم مجھے سیدھے سول ہسپتال لے جانا

پولیس ہسپتال نہیں..... سمجھیں۔“

فریدی نے کار روک دی اور کچھلی نشت پر جانے کے لئے اٹھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے

میں وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس کا آدھا دھڑکار کے پچھلے حصے میں تھا اور پیراگلی نشت پر۔

ریکھا ہسپتالی انداز میں اُسے آوازیں دے رہی تھی۔

دوسرا سفر

”وہ خطرے سے باہر نہیں ہیں۔“ سول سرجن نے اس کمرے میں آ کر کہا۔ جہاں لیڈی

انکپٹر ریکھا اور سارجنٹ رمیش موجود تھے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”کتا حیرت انگیز طور پر زہریلا معلوم ہوتا ہے۔“ سول سرجن نے پھر کہا۔

”میں آئی جی اور ڈی آئی جی کو فون کر چکا ہوں۔“

فریدی تنہا موجود تھا۔ ریش اور ریکھا بھی جا چکے تھے۔ اُن دونوں نے رات یہیں گزاری تھی۔ اس وقت فریدی بستر کی بجائے آرام کرسی پر تھا۔ مگر اُس کے چہرے سے یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کچھلی رات موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ چکا تھا۔ صرف پٹی کے علاوہ جو اس کی کلائی پر چڑھی ہوئی تھی۔ حمید کو اور کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔

فریدی اُسے دیکھ کر مسکرایا اور حمید کے ہونٹ کیکپانے لگے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ فریدی نے کہا۔ اُس کی آواز میں بھی اضطحال نہیں تھا۔ حمید چوروں کی طرح بیٹھ گیا۔ سنا سنا یا ہوا سا۔

”تم نے کچھلی رات بہت بہک کر کہا تھا کہ تم اب مجھے اپنی شکل نہیں دکھاؤ گے۔“

فریدی بدستور مسکراتا رہا۔

حمید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں فرش پر تھیں۔ فریدی بھی خاموش ہو گیا۔ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”میں نے رات قاسم کے یہاں بسر کی تھی۔ صبح کے اخبار میں خبر سے مجھے معلوم ہوا۔“

”ہاں! کتنا بہت زہریلا تھا۔ مگر شاید میری قوتِ دافعہ میں ابھی اخطا نہیں ہوا۔ بہر حال اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے اُس کتے کی فکر ہے۔ ایسا کتا آج تک میری نظر سے نہیں گذرا۔“

”آپ گھر کب چلیں گے۔“

”ابھی اور اسی وقت..... مجھے صرف تمہارا انتظار تھا۔ لیکن تم مجھے اس طرح لے چلو گے جیسے میں نقل و حرکت سے مجبور ہوں۔“

”کوئی خاص آئیڈیا.....!“ حمید اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

”ہاں..... قطعی.....!“

پھر حمید نے وجہ نہیں پوچھی۔ فریدی بستر پر جالیٹا اور حمید باہر نکل کر ایسولینس گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ چار آدمی ایک اسٹریچر لائے۔ فریدی کو بستر سے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا گیا، اس طرح وہ ایسولینس گاڑی تک پہنچا۔

حمید متحیر تھا کہ آخر فریدی کیا کرنا چاہتا ہے۔

”خ..... خطرے سے..... کک..... کیا مراد ہے آپ کی۔“

”یعنی..... وہ..... آپ کا ساتھ چھوڑ بھی سکتے ہیں۔“

”نہیں.....!“ ریش بے اختیار چیخا اور کسی بچے کی طرح پھوٹ پڑا۔ اُسے اپنے آفیسر سے بہت محبت تھی۔ وہ جو آفیسر سے زیادہ ایک بڑا بھائی تھا۔ ریکھا دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اچانک ایک ڈاکٹر نے کمرے میں آ کر کہا۔ ”وہ ہوش میں آ گئے ہیں۔“

”آہا.....!“ سول سرجن یلکھت اچھل پڑا۔ ”تب تو..... تب تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور تیزی سے دروازے میں مڑ گیا۔

ریش کی میساختہ قسم کی سسکیاں ابھی تک جاری تھیں، لیکن اُس نے کسی نہ کسی طرح برآمدے میں آ کر ریکھا کو یہ خوشخبری سنائی۔ ریکھا بھی ذہاں روی رہی تھی۔

کچھ انہیں دونوں پر منحصر نہیں تھا محکمے کا ہر وہ آدمی جو فریدی سے حسد نہیں رکھتا تھا اُسے بے حد چاہتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں کئی آفیسر وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں ڈی۔آئی۔ جی بھی تھا۔ لیکن حمید..... اُسے اس کا علم ہی نہیں تھا۔ ریکھا نے کئی بار گھر پر فون کیا مگر وہ قاسم کے یہاں تھا۔ دوسری صبح اُس نے یہ خبر اخبار میں پڑھی لیکن خبر بھی مکمل نہیں تھی۔ اس جیلے پر خبر کا اختتام ہوا تھا کہ دو بجے رات تک کرنل فریدی خطرے سے باہر نہیں تھے۔ ایک دوسرے اخبار میں لیڈی ریکھا کا بیان کردہ واقعہ بھی موجود تھا۔ حمید پریشان ہو گیا۔ پہلے اُس نے گھر کا رخ کیا۔ پھر وہاں سے سیدھا سول ہسپتال پہنچا۔ کپاؤنڈ ہی میں اُسے معلوم ہو گیا کہ فریدی کی حالت بہتر ہے، لیکن حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اُس کے سامنے جائے۔ فریدی رات بھر موت و حیات کی کشمکش میں رہا تھا اور وہ قاسم کے یہاں میٹھی نیند سویا تھا۔ اُسے شرمندگی تھی۔ حالانکہ یہ سب کچھ اس کی نادانستگی میں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی وہ فریدی کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

مگر جانا تو تھا ہی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے پرائیویٹ وارڈ کے اس کمرے میں قدم رکھا جہاں

”تو پھر تم ہی مجھے اس کتے کے متعلق کچھ بتا دو۔“
”میں کچھ نہیں جانتی۔“

”پھر تم نے سفید دھاریوں کے متعلق کیوں پوچھا تھا۔“
”یونہی..... عدنان..... یہاں سے جاؤ۔ میں اخبار دیکھ رہی ہوں۔“
”تم مجھے باہر نہیں نکلنے دو گی..... کیوں؟“

تویر دوبارہ اخبار دیکھنے لگی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”میں فریدی کو فون کرنے جا رہا ہوں۔“ عدنان بولا۔

”دفع ہو جاؤ..... یہاں سے۔“ تویر نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

عدنان چند لمحے اُسے گھورتا رہا پھر لائبریری سے چلا گیا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا تویر اخبار پھینک کر کھڑی ہو گئی۔ میز کی دراز سے ایک قلم تراش چاقو نکالا اور باہر نکل کر بڑی تیزی سے اس کی طرف چلنے لگی جدھر ٹیلی فون کے تار کا کھمبا تھا۔
اس نے ادھر ادھر دیکھا اور چاقو سمیت ٹیلی فون کے تاروں پر جھک پڑی۔ ذرا ہی سی دیر میں تار کٹ گئے۔ اب وہ پھر لائبریری ہی کی طرف واپس جا رہی تھی۔
لائبریری میں پہنچ کر اُس نے کال بل کا بٹن دبایا اور دوسرے ہی لمحے میں ایک باوردی چیر اسی اندر آ گیا۔

”باڈی گارڈ کو یہاں بھیج دو.....!“ اُس نے اس سے کہا اور پھر اخبار اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ مگر اس کے چہرے سے یہ نہیں ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے ابھی کوئی غیر معمولی کام انجام دیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد چاروں باڈی گارڈ لائبریری میں داخل ہوئے۔
”بیٹھ جاؤ.....!“ تویر نے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور ان کے بیٹھنے تک خاموش رہی..... پھر بولی۔ ”میں عدنان کو یہاں سے ہٹانا چاہتی ہوں۔“
”مگر آپ نے فرمایا تھا۔“



عدنان نے اخبار میز پر رکھ کر ایک طویل سانس لی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹپٹلے لگا۔ اس کے اندر اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اخبار اٹھا کر کوئی خاص خبر دوبارہ پڑھی اور اخبار کو توڑتا مڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔
راہداری میں ایک نوکر سے اس نے تویر کے متعلق پوچھا اور یہ معلوم کر کے کہ تویر لائبریری میں ہے وہ اسی طرف چلا گیا۔
تویر بھی اخبار ہی دیکھ رہی تھی۔ عدنان کی آہٹ پر چونک کر اُسے استفہامی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”تم نے وہ خبر پڑھی می..... کرنل فریدی کے متعلق۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم نے اس رات مجھ سے پوچھا تھا کہ کتے کے سر پر سفید دھاریاں تو نہیں تھیں۔“
”ہوں..... تو پھر.....!“ تویر نے اُسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ہونٹ سمجھنے لگے۔
”کچھ نہیں..... کرنل فریدی بڑا شاندار آدمی ہے۔ اگر وہ مر گیا تو مجھے بڑی کوفت ہوگی۔ ہم دونوں میں یونہی معمولی سی جان پہچان ہے۔ ایک بار ہمیں ایک ساتھ شکار کھیلنے کا اتفاق ہوا تھا..... کیا کہنے ہیں اس کے نشانے کے۔ خدا کی قسم ہاتھ چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔ می وہ بندر کی طرح پھرتا..... لومڑی کی طرح چالاک اور شیر کی طرح نڈر ہے۔“

”ہوں..... تو پھر.....!“

”میں اُسے دیکھنے جاؤں گا۔“

”تم گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکو گے..... دیے اگر نوکروں کے ہاتھوں بے عزتی پسند ہے تو میں کچھ نہیں کہتی۔“

”می..... تم مجھے خود کشی پر مجبور کر رہی ہو۔“ عدنان جھنجھلا گیا۔

”میری اجازت کے بغیر تم وہ بھی نہیں کر سکو گے۔“ تویر نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔
”تم مجھے نہیں روک سکو گی۔ اگر فریدی زندہ ہے تو ہم دونوں ملکر اس کتے کو تلاش کریں گے۔“
”اس سلسلے میں میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔“

”پوری بات سنو۔“ تویر نے بولنے والے کو ڈانٹ دیا۔

ایک لمحے کے لئے وہاں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ تویر کی کرخت آواز دیواروں اور چھت سے ٹکرا کر ایک قسم کی جھنکار سی پیدا کرنے لگی۔ ”تم لوگوں کو صرف باتیں بنانا آتی ہیں۔ عملی حیثیت سے صفر ہو۔ تم سے ابھی تک اتنا نہ ہو سکا کہ سعید بابر کو ٹھکانے لگا دیتے۔“ ”محترمہ! ہم تین بار کوشش کر چکے ہیں۔“ معمر آدی نے کہا۔ ”لیکن شاید ابھی اس کے ستارے گردش میں نہیں آئے۔“

”ہکو اس مت کرو۔۔۔۔۔ تم سب ٹکے ہو۔ وہ تو دور کی بات ہے۔ تم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ عدنان کو گمرانی میں رکھو۔ اسی عمارت میں رہ کر وہ خلاف حکم حرکتیں کر جاتا ہے اور تم آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے ہو۔“

”محترمہ وہ بھی مالک ہیں۔“

”جب میں اُسکے خلاف کوئی حکم دوں تو اُسے میرا بیٹا نہ سمجھو۔“ تویر آنکھیں نکال کر بولی۔ ”اب ایسا ہی ہوگا۔“ معمر آدی نے کہا۔ ”مگر وہ بے تحاشہ ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر اپنے بچاؤ کے سلسلے میں ہم سے کوئی گستاخی ہو جائے۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔!“

”گستاخی ہو جانے دو۔۔۔۔۔!“

”تو پھر اب اطمینان رکھئے کہ وہ آپکے حکم کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکیں گے۔“

تویر تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”میں اُسے یہاں سے ہٹانا چاہتی ہوں۔ مگر ٹھہرو! تم نے فریدی کے متعلق پڑھا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔!“ معمر آدی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”اور ہمیں افسوس ہے کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔“

”کیا خبر ہے۔“

”اُسے اسٹریچر پر ڈال کر گاڑی میں رکھا گیا اور کیپٹن حمید اسے گھر لے گیا۔“

”جب وہ اپنے پیروں سے چل بھی نہیں سکتا تو اُسے ہسپتال سے کیوں ہٹایا گیا۔“

”خدا ہی جانے۔“

”خیر مجھے اس سے بحث نہیں۔“ عدنان اور فریدی ایک دوسرے کے شناسا ہیں۔ عدنان پر بھی ایک کتے ہی نے حملہ کیا تھا اور اتفاق سے وہ کتا بھی اسی قسم کا تھا جس کے متعلق اخبارات میں آیا ہے۔ لہذا عدنان فریدی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فی الحال میں نے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے ہیں۔ مگر یہ طریقہ زیادہ دیر تک کامیاب نہیں ثابت ہو سکتا۔“

وہ فریدی سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔“ معمر آدی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔!“

”تو کیا آپ انہیں اپنے حالات سے بالکل علی الاطم رکھتی ہیں۔“

”شٹ اپ۔۔۔۔۔ تمہیں اس سے کوئی بحث نہ ہونی چاہئے۔“

”میں۔۔۔۔۔ جانتا ہوں۔۔۔۔۔ محترمہ۔۔۔۔۔!“ معمر آدی گڑ گڑایا۔

”آج رات اُسے یہاں سے ہٹا دو۔“

”جو حکم ہو۔“

”قریب آؤ۔۔۔۔۔ اپنی کرسیاں قریب کھسکاؤ۔“



رات اندھیری تھی اور کیپٹن حمید سارجنٹ رمیش کے ساتھ سعید بابر کی کوشی کے گرد منڈلا رہا تھا مگر سارجنٹ رمیش کو اسکیم نہیں معلوم تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اندھیرے میں سر مارنے کا مقصد کیا ہے۔

”یہ چکر کیا ہے بڑے بھائی۔“ رمیش بڑبڑایا۔

”بد نصیبی۔۔۔۔۔!“ حمید ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”گدھے بھی اس وقت گھاس رہے

ہوں گے لیکن ہم سردی کھا رہے ہیں۔ رمیش کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی۔ پھر تم اس محکمے میں کیوں جھک مار رہے ہو۔“

”تو تمہارے ساتھ کون سی مصیبت ہے۔ تم بھی تو آزاد ہو۔ تم کیوں یہاں جھک مار

رہے ہو۔“ رمیش نے کہا۔

”میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میری شادی نہ ہو جائے۔ اُس وقت کیا ہوگا۔“

”آپ کو شادی کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

”میں ماریٹھوں کا تمہیں..... تم بھی یہی کہتے ہو۔“

”میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ درجنوں لڑکیاں تو تمہارے ساتھ ماری ماری پھرتی ہیں۔“

”آہ..... یہی تو تم نہیں سمجھتے۔ اس راز سے واقف نہیں ہو۔ نہ سمجھو تو بہتر ہے۔“

”آخر پھر بھی۔“

”چھوڑو..... ہم اس وقت ڈیوٹی پر ہیں۔ ہمیں لڑکیوں کی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔“

”انسپکٹر ریکھا کی بات کرو..... وہ تو اپنے ٹھکے ہی کی ہیں۔“ رمیش نے قہقہہ لگایا۔ وہ

ٹھیلنے ہوئے عمارت کی پشت پر جا نکلے۔

”ریکھا.....“ حمید کہہ رہا تھا۔ ”اس نے شائد فریدی صاحب سے پریم اشارت کر رکھا ہے۔“

”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔ دن میں کم از کم دس بار صاحب کے کمرے میں آتی ہیں۔“

”ہائے..... ریگ زاروں میں کہیں ہوتی ہے پانی کی نمود..... آپ بھگتے گی..... کرل ہارڈ

اسٹون کو مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھتا۔ دنیا کی ڈیڑھ درجن حسین ترین عورتوں کو میں جانتا

ہوں جو آج بھی کرل ہارڈ اسٹون کو سافٹ کوک بنانے کے چکر میں ہیں۔“

”واقعی حمید بھائی..... سمجھ میں نہیں آتا کہ کرل صاحب عورتوں سے اتنا بدکتے کیوں ہیں۔“

”نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔ کیا تم نے انہیں کبھی کسی عورت کے ساتھ ناچتے نہیں دیکھا۔“

”نہیں.....“ رمیش نے حیرت سے کہا۔

”آہ..... تم نے نہیں دیکھا۔ اُس وقت وہ حضرت پرانے کھلاڑی اور پرلے سرے کے

عیاش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت..... میرا دعویٰ ہے کہ اس شخص میں عورت کے حسن سے

محظوظ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اگر ضرورتاً انہیں کسی بھینس کے ساتھ ناچنا پڑے تب بھی

وہ اتنے ہی ہشاش بشاش نظر آئیں گے۔“

”کمال ہے..... یہاں تو یہ عالم ہے کہ اگر کبھی کسی لڑکی نے مسکرا کر بات کر لی تو ہمتوں

کی نیندیں حرام..... بس یہ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سچ مجھ پر عاشق ہوگئی ہو اور ایسے میں دل
کھینے لگتا ہے دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ یقیناً وہ بھی اپنے فراق میں اسی طرح تڑپ
رہی ہوگی۔“

”ہائیں.....!“ حمید نے متحیرانہ انداز میں کہا۔ ”رمیش! تم مادر زاد عاشق معلوم ہوتے ہو

۔ اس کے باوجود بھی کرل ہارڈ اسٹون کی نظر میں اچھے کے اچھے۔“

”میں لڑکیوں کی دم میں تو نہیں بندھا رہتا۔“ رمیش نے طحیہ لہجے میں کہا۔

”لڑکیوں کے متعلق سوچنے رہنا اس سے بھی برا ہے فرزند.....!“

”مارو گولی.....!“ رمیش نے ہاتھ جھک کر کہا۔ ”سردی لگ رہی ہے۔ آخر ہم کب تک

اس طرح جھک مارتے پھریں گے۔“

جب تک کہ سعید باہر کے دشمن اُسے ختم نہ کر دیں۔ یہ لوگ غیر ممالک سے اسی لئے آتے

ہیں کہ ہم کام چور اور ٹکے نہ ہونے پائیں۔“

”کیا اس کے کچھ دشمن بھی ہیں۔“ رمیش نے پوچھا۔

حمید اثبات میں جواب دے کر ایک دیوار سے ٹک گیا۔ رمیش سعید باہر کے ہم شکل فقیر کو

دیکھ چکا تھا لیکن اُسے اُن واقعات کا علم نہیں تھا، جو اس کے بعد ظہور پذیر ہونے والے تھے۔

فریدی نے شروع سے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ سعید باہر کی ذات سے تعلق رکھنے والے کسی

بھی واقعہ کا ذکر اخبارات میں نہ آنے پائے اور اس نے سعید باہر کو تاکید بھی کر دی تھی کہ ان

واقعات کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتائے۔ سعید باہر نے اس پر حیرت بھی ظاہر کی تھی۔ لیکن فریدی

نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ بات پھیلنے پر پریس رپورٹر اُس کی زندگی تلخ کر دیں گے۔

”تو وہ یہاں مقیم کیوں ہے۔“ رمیش نے پوچھا۔

”پتہ نہیں! اگر وہ مرنا ہی چاہتا ہے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ حمید دیوار سے اپنی

پشت الگ کرتا ہوا بولا۔

وہ پھر ٹھیلنے ہوئے سڑک کی طرف چل پڑے۔ سعید باہر کی کمپاؤنڈ اب تاریک ہو چکی

تھی۔ برآمدہ بھی تاریک تھا۔ حمید اور رمیش سلاخوں دار پھانک کے قریب آ کر رک گئے۔ یہ

کونھی ایک ایسی جگہ پر واقع تھی جس کے آس پاس کوئی الیکٹرک پول نہیں تھا اس لئے پھانک کے قریب وجوار میں تاریکی ہی رہتی تھی۔

پھانک اندر سے بند تھا لیکن اس کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔ پہلی ہی کوشش میں حمید دوسری طرف پہنچ گیا۔ رمیش باہر ہی رہا۔ حمید نے آہستہ سے کہا۔

”چلے آؤ۔“

رمیش نے اس کی تقلید کی۔ اندر چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

”کرائی کی بازو کی اوٹ ہی میں رہنا۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔

عمارت میں کہیں بھی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حمید نے اپنی ریڈیم ڈائسل والی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ پورچ کی طرف بڑھتے رہے۔

ادھر تین دنوں سے برابر سعید بابر شکایت کرتا رہا تھا کہ چند نامعلوم آدمی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ جاگ کر راتیں گزارتا ہے۔ آج یہاں ان دونوں کی موجودگی کی یہی وجہ تھی۔

وہ تقریباً ایک بجے تک سرگرداں رہے لیکن سعید بابر کے بیان کی تصدیق نہ ہو سکی۔

”کیوں نہ اب میں ہی حملہ کر دوں۔ اس الو کے پٹھے پر۔“ حمید نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور رمیش ہنسنے لگا۔

”نہیں یار.....!“ حمید پھر بولا۔ ”کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہئے۔ مجھے یہ آدمی بھی بڑا پراسرار معلوم ہوتا ہے۔ سنو! کیوں نہ ہم اندر چلیں۔ میرا خیال ہے کہ کوئی کھڑکی آزمانی چاہئے۔“

”اگر تم نے ایسی کوئی حماقت کی تو بھگتو گے۔“ حمید نے اپنے پیچھے ایک تیز قسم کی سرگوشی سنی اور بیساختہ اچھل پڑا۔ رمیش بھی بوکھلا گیا۔

”چلو اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اپنا اطمینان کر چکا ہوں۔“ وہی آواز پھر آئی۔ لیکن اس بار حمید نے پہچان لیا۔ یہ فریدی کی آواز تھی اور اب وہ کرائی بازو پھلانگ کر ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”عمارت خالی ہے۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”سعید بابر اندر موجود نہیں ہے۔“

”مگر آپ کیوں چلے آئے۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”آپ تو خود کو صاحب فراش ظاہر کرنا چاہتے تھے۔“

”وہ تو میں اب بھی ہوں لیکن اُجالے میں تم مجھے پہچان نہ سکو گے۔“

”میک اپ.....!“ حمید نے کہا۔

”ہاں..... اب اس کے بغیر کام چلنا نظر نہیں آتا۔“

”تو آپ آرام نہیں کریں گے۔ آپ کی کلائی بُری طرح زخمی ہو گئی ہے۔“

”پرواہ نہ کرو..... اب یہاں سے نکلو۔ ہمیں بالی کمپ کی طرف چلنا ہے۔“

حمید جھلا گیا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ وہ سمجھا تھا کہ اب یہاں سے گھر ہی کی طرف جانا ہوگا۔ شدید سردی کے احساس کے باوجود بھی اس کی پلکیں نیند سے جھکی آ رہی تھیں۔ وہ کمپاؤنڈ سے باہر آئے۔ تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد فریدی اپنی گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔

”تم کارڈ رائیو کرو گے۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

”اس وقت مجھ سے یہ کام نہ لیجئے ورنہ کار سمیت کسی درخت ہی پر بسیرا ہوگا۔“

”بکو اس مت کرو۔“

”نیند کا یہی عالم ہے جناب۔“

”رمیش تم ڈرائیو کرو..... کیا تمہیں بھی نیند آ رہی ہے۔“

”جی نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

رمیش اور حمید انگلی نشست پر جا بیٹھے اور فریدی نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ کچھ دیر بعد کار سنان سڑکوں پر چکراتی ہوئی بالی کمپ کی طرف جارہی تھی اور حمید کھڑکی پر بازو ٹیکے بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔

رمیش ہمیں جلد پہنچنا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”رفتار تیز کرو۔“

”بہت بہتر جناب۔“ رمیش نے کہا اور رفتار تیز کر دی۔

اس وقت وہ اسی سڑک پر تھے جس پر چند روز قبل فریدی کو ایک حیرت انگیز تجربہ ہوا تھا۔ فریدی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ریوالور کے دستے پر اُس کی گرفت بہت مضبوط تھی مگر آج وہ بخیر و

خوبی اس سڑک سے گزر گیا۔

جب کار بلی کمپ والی سڑک پر مڑ رہی تھی۔ فریدی نے حمید کو سمجھوڑ کر اٹھا دیا۔

”تم جھولے پر نہیں ہو فرزند.....!“ اُس نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

حمید کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ویسے اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کار سے چھلانگ لگا دے۔ آنکھوں میں جلن سی محسوس ہونے لگی تھی اور کھوپڑی ہوا میں معلق معلوم ہو رہی تھی۔

”زمینش کار روک دو۔“ فریدی نے کہا اور زمینش نے رفتار کم کر کے کار کو سڑک کی کنارے لگا دیا۔ فریدی حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولا۔ ”یہ کام بہت اہم ہے۔ ورنہ میں ایسی صورت میں بستر مرگ سے اٹھنے کی زحمت کیوں گوارا کرتا۔“

حمید خاموش ہی رہا۔ بہر حال وہ اب ذہن کو نیند کے بیچ و خم سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور خود اُسے بھی احساس ہو چلا تھا کہ اس وقت جھلاہٹ کا مظاہرہ قطعی بے نکار ہے گا۔

”اس کام کا سارا دار و مدار تم پر ہے۔“ فریدی بولا۔

”ہاں..... اچھا..... پھر.....!“

”ہاں..... اچھا..... پھر کیا؟ کیا ابھی تک نیند سوار ہے۔“

”نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”تمہیں وہ نیگرو شکاری زغالی یاد ہے نا جو کبھی نواب وجاہت مرزا کے یہاں میر شکاری

کی حیثیت سے ملازم تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”اس وقت ہم اُسی کے پاس جا رہے ہیں اور ہمیں اُس سے اُن نشانات کے متعلق

معلومات حاصل کرنی ہیں جو سعید باہر کی کمپاؤنڈ میں ملے تھے۔“

”وہ کیا بتا سکے گا۔“

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار اس نے ایسے ہی حیرت انگیز نشانات کا تذکرہ کیا تھا اور

بات غالباً افریقہ نیروبی ہی کی تھی..... البتہ وہ واقعہ یاد نہیں آ رہا ہے جس کے سلسلے میں اس نے

بات چھیڑی تھی۔“

”زغالی کہاں ہے۔“

”بالی کمپ کی ایک بستی میں۔ میں تمہیں وہیں لے چل رہا ہوں۔ خطرناک آدمیوں کی بستی ہے۔ ہر وہ آدمی جو رات میں نظر آئے اُس کے سامنے زغالی کا نام ضرور لینا ورنہ جسم پر کپڑے بھی نظر نہ آئیں گے۔“

”یہ آپ کہہ رہے ہیں؟“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”ہاں میں کہہ رہا ہوں..... یہ موقع ہی ایسا ہے کہ میں بات نہیں بڑھانا چاہتا.....

سمجھے..... زغالی تمہیں یقیناً پہچان لے گا۔ میرے متعلق تم کہہ سکتے ہو کہ میں علم الاجسام کا ایک پروفیسر ہوں اور میرے پاس کسی حیرت انگیز جانور کے پیروں کے نشانات کے فوٹو ہیں اور تم مجھے اس کے پاس اسی لئے لائے ہو کہ وہ مجھے اپنی معلومات سے فائدہ پہنچائے۔“

اس کی درندگی

چاروں طرف کچے کچے مکانات کے سلسلے بکھرے ہوئے تھے۔ بستی میں گھسٹا دشوار ہو گیا

تھا۔ چاروں طرف کتوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ پھر ذرا ہی سی دیر میں ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ساری بستی جاگ پڑی ہو۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک ر ایک گلی میں چار آدمی ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نے ان پر نارچ کی روشنی ڈالی۔

”ہم زغالی کے پاس جا رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔

”اوہہ جاییے..... جاییے.....!“ نارچ والا ایک طرف ہٹا ہوا بولا۔ ”کیا آپ اندھیرے

ہی میں جائیں گے۔ آپ کے پاس نارچ نہیں ہے۔“

”نہیں..... ہم سے غلطی ہوئی۔ لانا بھول گئے۔“ حمید بولا۔

”چلے..... میں آپ کو راستہ دکھاتا ہوں۔!“ نارچ والے نے کہا۔

وہ لوگ پھر چل پڑے۔ ایک آدمی نارچ کی روشنی میں انہیں نہ صرف راستہ دکھا رہا تھا

بلکہ ان کتوں کو ڈانٹتا بھی جا رہا تھا جو ادھر ادھر کی گلیوں سے نکل کر بھونکنے لگتے تھے۔

پھر وہ ایک پختہ عمارت کے سامنے رک گئے جو سرخ اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ عمارت بہت پرانی تھی اور اس کی اینٹوں میں لونا لگنے لگا تھا۔
ان کا راہبرد ہاں پہنچ کر رخصت ہو گیا۔

حمید نے صدر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی اور اُس وقت تک کھٹکھٹاتا رہا جب تک کہ اندر سے ایک غصیلی آواز نہیں آئی۔

”کون ہے.....!“ کسی نے دھاڑ کر پوچھا۔

”ایک ضرورت مند..... دروازہ کھولو.....!“ حمید نے کہا۔

”کیا صبح نہ ہوتی۔“ کسی نے دروازے کے قریب آ کر کہا۔ ”تم کون ہو!“

”میں کیپٹن حمید ہوں..... مرکزی سی آئی ڈی کا ایک آفیسر۔“

دوسری طرف سے ایک ہلکی سی غراہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی دروازہ چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

اندر زرد رنگ کی ہلکی سی روشنی تھی اور ان کے سامنے ایک چوڑا چکاگر معمر نیکرو کھڑا تھا۔ اُس کی گردن شانوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ وہ بڑے غور سے حمید کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔
”بے شک آپ وہی ہیں..... مگر مجھے حیرت ہے اتنی رات گئے۔“

وہ اُن کے آگے چلے لگا۔ اس کی چال عجیب تھی۔ اس طرح اچھل اچھل کر چل رہا تھا جیسے ٹانگیں چھوٹی بڑی ہوں۔

وہ انہیں ایک ایسے کمرے میں لایا جہاں بید کی تین چار میلی سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار سے ایک رائفل لٹکی نظر آ رہی تھی۔ یہاں مٹی کے تیل کا ایک لیپ تھا جسے زغالی نے آتے ہی روشن کر دیا تھا۔

”آپ لوگ بیٹھے.....!“ اس نے قدرے جھک کر کہا۔

یہ تینوں بیٹھ گئے۔ ریش حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُس نیکرو کی طرف بھی دیکھتا لیکن کچھ اس انداز میں کہ فوراً ہی دوسری طرف دیکھنے لگتا جیسے وہ اُس سے خوفزدہ نہ ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاں..... اب بتائیے..... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”یہ پروفیسر دیال ہیں۔ علم الاجسام کے ماہر۔“ حمید نے فریدی کی طرف اشارہ کیا جو میک اپ میں تھا۔

”علم الاجسام کیا۔“ زغالی نے سوال کیا۔

”آپ ہی بتائیے جناب۔“ حمید نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بات یہ ہے کہ میں پہلے کرنل فریدی کے پاس گیا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا۔ میرے پاس دراصل چند حیرت انگیز نشانات کے فوٹو ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی جانور کے پیروں کے نشانات ہیں مگر اس قسم کا کوئی جانور میرے علم میں نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ کرنل فریدی بھی لاسلمو ود معلومات رکھتے ہیں اسی لئے میں اس سلسلے میں ان کے پاس گیا تھا مگر انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ پھر آپ کا پتہ بتایا کہ آپ ضرور با ضرور ان پر روشنی ڈال سکیں گے۔“

”مگر اس کے لئے آپ دن کو بھی آ سکتے تھے۔“ زغالی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”دیکھتے بات دراصل یہ ہے۔“ فریدی جلدی سے بولا۔ ”یہ نشانات کئی دنوں سے یونیورسٹی میں زیر بحث ہیں۔ ہم میں سے کئی پروفیسر ان کے متعلق تحقیقات کر رہے ہیں۔ کل صبح ہی اپنی رپورٹیں پیش کرنی ہوں گی۔ بس اسلئے دوڑا آیا کہ شاید آپ سے کچھ مدد مل جائے۔“
زغالی تھوڑی دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”لایئے..... وہ نشانات کہاں ہیں؟“
فریدی نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسکی طرف بڑھا دیا جس پر دو نشانات کا عکس تھا۔
”یہ نشانات کہاں ملے تھے۔“ زغالی نے آہستہ سے پوچھا۔

”لازکال جنگل میں۔“ فریدی نے جواب دیا۔

زغالی خاموشی سے نشانات کو دیکھتا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”نہیں میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے نشانات نہیں دیکھے۔ اگر اس قسم کا کوئی جانور لازکال جنگل میں موجود ہے تو اس کا شکار بڑا دلچسپ رہے گا۔“

پھر حمید کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔ ”کرنل صاحب تو یقیناً اس جانور کی تلاش میں ہوں گے۔“

”میں نے آج ہی اُن سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

زغالی نے سر جھکا لیا۔ اس کی پیشانی پر شکلیں تھیں۔ کمرے میں گہرا سکوت مسلط ہو گیا۔
لیپ کی بدھم روشنی میں زغالی کا چہرہ بڑا بھیاں لگ رہا تھا۔

اچانک حمید بولا۔ ”مگر کرنل صاحب نے تو کہا تھا کہ تم ان نشانات کے متعلق کچھ بتا سکو گے۔“
”یہ کس بناء پر کہا تھا، انہوں نے۔“ زغالی نے سر اٹھا کر پوچھا۔ لیکن اب وہ اُن میں سے کسی کے بھی چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں چہرے کی جھریاں کی ہوئی کھال میں ایسی ہی لگت رہی تھیں جیسے وہ کسی سالخوڑہ مگر خونخوار گینڈے کی آنکھیں ہوں۔
”تم نے شاید کبھی اُن سے اس قسم کا تذکرہ کیا تھا۔ ایسے نشانات غالباً افریقہ میں کہیں تمہاری نظروں سے گزرے تھے۔“

”مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اس قسم کی گفتگو کی ہو۔ ویسے میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کرنل غلط کہتے ہیں۔ اب دیکھئے نامیں کتنا بوڑھا ہوں اسی لئے بھلکدو بھی ہو گیا ہوں۔ آپ سمجھتے ہیں نا۔“
”تو پھر..... گویا..... مجھے یہاں بھی ناکامی ہوئی۔“ فریدی بڑبڑایا۔

زغالی کچھ نہ بولا۔ بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔
دفعۃً فریدی اٹھ گیا۔ ”اچھا تو میں نے ناحق آپ کو تکلیف دی۔“
”کوئی بات نہیں ہے جناب۔ میں کرنل صاحب اور اُن کے دوستوں کا خادم ہوں۔“
حمید اور رمیش بھی اٹھ گئے۔ صدر دروازے تک وہ خاموشی سے آئے پھر زغالی نے حمید سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہر خدمت کے لئے مجھے ہر وقت یاد رکھئے۔“
ان کے باہر نکلتے ہی دروازہ آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ وہ چل پڑے۔ فریدی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

گلی کے موڑ پر انہیں رک جانا پڑا کیونکہ گلی پتلی تھی اور دوسری طرف سے چار آدمیوں کا ایک جلوس اس گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ چاروں ایک لائن میں تھے اور انہوں نے ایک بہت لمبا بٹل اپنے کاندھوں پر سنبھال رکھا تھا۔

وہ اُن کے قریب ہی سے گذر گئے۔ فریدی زک گیا تھا۔ حمید نے آگے بڑھنا چاہا لیکن

اس نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

وہ چاروں آدمی زغالی کے مکان کے سامنے رک گئے تھے اور اب دروازے کی زنجیر ہلا رہے تھے۔

فریدی چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر گلی میں مڑ گیا۔

وہ سڑک پر نکل آئے۔ ٹھیک گلی کے سامنے ہی انہیں کار نظر آئی۔ فریدی رک گیا۔ کار خالی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر سگار لائٹر جلا کر روشنی میں ڈیش بورڈ پر نظر ڈالنے لگا۔ اچانک اس نے مڑ کر حمید سے کہا۔ ”حمید اس کار کے نمبر نوٹ کر لو۔ غالباً انہیں لوگوں کی کار ہے جو ابھی گلی میں ملے تھے..... اور تم دونوں واپس جاؤ۔“

”کیا ہمیں کار چھوڑنی پڑے گی۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں کار لے جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور بڑی تیزی سے اسی گلی میں چلا گیا۔

”چلو مری جان.....“ حمید رمیش کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ایک طویل سانس لیتا ہوا بولا۔
”نمبر نوٹ کر لو۔“

”ہاں..... نمبر.....“ حمید نے کہا اور دیا سلائی جلا کر کار کے نمبر دیکھے اور انہیں ذہن نشین کرتا ہوا سیدھا ہو گیا۔

”آؤ چلیں..... ذرا سی دیر میں میں بھی مرغوعوں کی طرح بانگ دیئے لگوں گا۔ صبح تو ہو ہی رہی ہے۔“

وہ اپنی کار میں آ بیٹھے۔ حمید نے اس بار بھی رمیش ہی سے ڈرائیو کرنے کی استدعا کی۔ اس نے بہت دیر سے پائپ نہیں پیا تھا۔

سردی بے تحاشہ بڑھ گئی تھی۔ پائپ کے دو تین گہرے کش لینے کے بعد اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔

”پتہ نہیں وہ چاروں کیا اٹھائے ہوئے تھے۔“ رمیش نے کہا۔

”یار جہنم میں ڈالو۔ ہمیں اس سے کیا کہ لقا کبوتر دم کیوں اٹھائے رہتا ہے۔ مگر تم کیا کرو۔ اس محکمے کی ملازمت ہی ایسی ہے۔ چوبیس گھنٹے سرائے رساں بنے رہئے۔“

”نہیں حمید بھائی..... وہ بٹل عجیب تھا۔ اتنا لمبا بٹل آخر اس میں تھا کیا۔“
”اُس کس کریم!“

ریش خاموش ہو گیا..... کارسزک پر دوڑتی رہی۔



صبح کے نو بجے تھے۔ دھوپ اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ تنویر اپنی لائبریری میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ وہ صبح کی چائے لائبریری ہی میں پیتی تھی۔ یہ اُس کا معمول تھا۔ چائے کے دوران میں اخبار دیکھتی رہتی۔ کھانا بھی تنہا ہی کھاتی۔ کم از کم اس کے بیٹے عدنان کو تو یاد نہیں تھا کہ کبھی وہ دونوں کھانے کی میز پر ساتھ بیٹھے ہوں۔ اُس کی کوٹھی میں آئے دن دعوتیں بھی ہوتی رہتی تھیں لیکن وہ کبھی مہمانوں کے ساتھ نہ بیٹھتی۔ میزبانی کے فرائض عدنان کو انجام دینے پڑتے۔ وہ تو اپنی ماں کو نیم دیوانی ہی سمجھتا تھا۔

تنویر اخبار ایک طرف میز پر پھینک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ باہر ہی جا رہی تھی کہ ایک ملازم نے آکر اس کو فون کال کی اطلاع دی۔

تنویر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں فون تھا۔ اس نے لاپرواہی سے ریسیور اٹھالیا اور غصے سے آواز میں ”ہیلو“ کہا۔

ذرا ہی سی دیر میں اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ دوسری طرف سے بولنے والا کوئی ایسی ہی بات کہہ رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا ”کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔“

پھر وہ دوسری طرف سے بولنے والے کا جواب سنتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا صحت مند چہرہ کسی پرانے مریض کا چہرہ معلوم ہونے لگا تھا۔

”ہوں..... اچھا.....!“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”تم بالکل پرواہ نہ کرو۔ میں دیکھوں گی۔ ویسے یہ میرا مشورہ ہے کہ تم اب وہاں سے ہٹ جاؤ۔ کیوں کیا خیال ہے۔“

جواب میں پھر کچھ کہا گیا اور تنویر سر ہلا کر بولی۔ ”جہاں بھی جاؤ مجھے اپنی جائے قیام سے

باہر رکھنا..... اچھا..... ہاں دیکھو..... مجھے تم پر ہمیشہ سے اعتماد رہا ہے۔ تم مر جاؤ گے لیکن کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہو گے۔ اچھا.....!“

اُس نے سارے ملازمین کو اکٹھا کیا۔ نجی دفتر کی کلرک لڑکیوں کو بھی وہیں بلوایا۔

”تم سب.....!“ وہ انہیں مخاطب کر کے بولی۔ ”میں منٹ کے اندر اندر کوٹھی خالی کر دو۔

یعنی آج چھ بجے شام تک کیلئے تم سب کو چھٹی ہے۔ میں ہیڈ آفس فون کر رہی ہوں۔ وہاں سے آج کیلئے تمہیں تفریح الاؤنس ملے گا۔ میں منٹ کے اندر اندر یہاں سے چلے جاؤ۔“

پھر وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اندر چلی آئی۔ ملازمین کی اس بھیڑ میں اس کے چاروں باڈی گارڈ شامل نہیں تھے۔

میں منٹ کے اندر ہی اندر کوٹھی میں اُلو بولنے لگی۔ نوکروں کو اس کے رویہ پر ذرا برابر بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس قسم کی انہونی باتوں کے عادی ہو چکے تھے ان کا بھی یہی خیال تھا کہ تنویر ایک نیم دیوانی عورت ہے۔

کمپاؤنڈ کا پھانک تنویر نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیا۔ چاروں باڈی گارڈ بھی متحیر نہیں تھے۔ اُن کی مجال نہیں تھی کہ وہ تنویر کے کسی کام میں دخل دے سکتے۔ خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ آخر تنویر نے تھوڑی دیر بعد اُن چاروں کو طلب کیا۔

”تم کل اُسے لے کر وہاں کس وقت پہنچے تھے۔“

”شاید تین بجے تھے۔“ معمر آدمی نے جواب دیا۔

”کیا اُسے ہوش آ گیا تھا۔“

”جی نہیں..... وہ زغالی کے مکان پر پہنچ کر بھی بیہوش ہی رہے تھے۔“

”تمہاری موجودگی میں اُسے ہوش آ گیا تھا۔“

”نہیں محترمہ..... ہم زغالی کو سب کچھ سمجھا کر واپس آ گئے تھے۔“

”ہوں.....!“ وہ انہیں غور سے دیکھتی ہوئی سرد لہجے میں بولی۔ ”مگر اب عدنان وہاں

نہیں ہے۔“

”میں نہیں سمجھا محترمہ.....!“ معمر آدمی نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو۔“ تنویر آہستہ سے بولی۔ ”تمہارے وہاں پہنچنے سے تھوڑی سی دیر قبل کیپٹن حمید وہاں دو آدمیوں کے ساتھ پہنچا تھا۔“

”وہ وہاں کس لئے گیا تھا۔“ معمر آدمی نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

”پتہ نہیں.....!“ تنویر نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔ ”بہر حال چار اور پانچ کے درمیان عدنان غائب ہو گیا جس کمرے میں اُسے رکھا گیا تھا اس کا قفل ٹوٹا ہوا ملا اور صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ زغالی اُسے کمرے میں بند کر کے سو گیا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔“

”کیپٹن حمید وہاں کیوں گیا تھا۔“ معمر آدمی بڑبڑایا۔

”تو تمہارا خیال ہے کہ یہ حرکت انہیں لوگوں کی ہے۔“

”جی ہاں..... پھر ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے۔ اسکے علاوہ اور کیا سمجھیں گے۔“

”میں نے اُسے وہاں کیوں بھجوایا تھا۔“

”تا کہ وہ فریدی تک نہ پہنچ سکیں۔“

”پھر.....!“ تنویر اُسے گھورنے لگی۔

”محترمہ آپ یقین کیجئے۔“ معمر آدمی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہم نے اُس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اُن لوگوں کو کیسے خبر ہو گئی۔“

تنویر کچھ نہیں بولی۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اُس نے کہا۔ ”اب ایک دوسری اسکیم ہے لیکن تم زیادہ محتاط رہو گے۔“

”فرمائیے محترمہ.....! ہم شاید اسی بار آپ کا کام صحیح طور پر انجام دے سکیں۔ ویسے آج کل شاید ہمارے ستارے ہی گردش میں ہیں جس کام میں ہاتھ لگاتے ہیں بگڑ جاتا ہے۔“

”پردہ مات کرو..... اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔“ تنویر مسکرا کر بولی اور وہ چاروں بیساختہ چونک پڑے۔ انہوں نے اپنے ہوش میں پہلی بار تنویر کو مسکراتے دیکھا تھا۔

”میں فی الحال تمہیں اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ مگر اس کی کیا ضمانت

ہے کہ وہ راز ہمیشہ تم چاروں ہی تک محدود رہے گا۔“

”ہماری وفاداری میں شبہ نہ کیجئے۔ ہم نے ہر موقع پر آپ کیلئے جان کی بازی لگائی ہے۔ ضمانت میں ہم صرف اپنی وفاداری ہی پیش کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ہماری سب سے بڑی قسم ہے۔“

”اچھا تو آؤ..... میں تمہیں عمارت کے اس حصے میں لے چلوں گی جہاں آج تک میرے علاوہ اور کوئی نہیں جاسکا۔“

”ہم اسے اپنی سرفرازی سمجھیں گے۔“ معمر آدمی نے قدرے جھک کر کہا۔

”تم کبھی کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرو گے۔“

”کبھی نہیں محترمہ..... آپ ہم پر اعتماد کیجئے۔“

”اچھا تو آؤ میرے ساتھ۔“

وہ اُس راہداری میں چل رہے تھے جس کے سرے پر وہ دروازہ تھا جس کی دوسری طرف کا حال تنویر کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم تھا۔

تنویر نے دروازے کا قفل کھول کر دونوں پٹ کھول دیئے۔ کمرہ تاریک تھا۔

”چلو.....!“ تنویر ایک طرف ہٹتی ہوئی بولی۔ معمر آدمی سب کے آگے تھا۔ وہ کسی

چمکیا ہٹ کے بغیر اندر چلا گیا۔ اُس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تھلید کی۔ تنویر کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اُن چاروں کے بعد کمرے میں چلی جائے گی۔ مگر اُس کا رویہ خلاف توقع تھا۔ اُس نے دوسرے ہی لمحے میں دروازے کے پٹ کھینچ کر باہر سے بند کر لئے۔

”محترمہ.....!“ اندر سے آواز آئی۔ مگر تنویر قفل چڑھا چکی تھی۔

پھر اُس نے چیخ کر کہا۔ ”مذونگا تیرے شکار۔ تیری بہت پرانی خواہش پوری ہو گئی۔ آدمی

کا گوشت۔“

”محترمہ..... محترمہ.....!“ چاروں بیک وقت چیخے اور پھر اچانک ان کے حلق سے عجیب

قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔

”بچاؤ..... بچاؤ.....“ کے شور کے ساتھ ہی ریلوے انجن کی سیٹیاں بھی گونج رہی تھیں۔

”محترمہ..... تنویر.....!“

بھیجی گئی تھیں مگر میڈیکل کالج کے رجسٹر میں صرف تین لاشوں کی وصولیابی درج ہے۔“

”اوہ.....“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”مگر اب آپ اُس لاش کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہیں۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سعید بابر کے ایک ہم شکل کی لاش صدر میں پائی گئی تھی۔“

”یہ کھلی ہوئی حقیقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔“

”کچھ نہیں..... میں فی الحال کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ ویسے یہ ضروری نہیں کہ وہ آدمی سعید ابراہیم کا بھائی ہی رہا ہو۔“

”اگر رہا بھی تو اب کیا ہو سکتا ہے۔“ حمید جھنجھلا گیا۔

”اس مسئلے کو ہمیں چھوڑ دو.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”فی الحال میں زعالی میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہوں۔ تم نے پچھلی رات کیا محسوس کیا تھا۔“

”یہی کہ وہ ان نشانات کے متعلق کچھ جانتا ہے لیکن بتانا نہیں چاہتا۔“

”ٹھیک ہے..... لڑکال جنگل کے نام پر اُسے کتنی حیرت ہوئی تھی..... یاد ہے۔“

”جی ہاں..... مجھے یاد ہے۔ لڑکال جنگل کا نام سن کر وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا تھا۔“

”اچھا خیر..... چھوڑو..... مجھے اطلاع ملی ہے کہ زغانی آج ہی صبح کو بالی کمپ والی بستی

سے ہٹ گیا ہے۔ اس وقت وہ راجن پورے کی شاہپور بلڈنگ کے سائوئس فلیٹ میں ہے۔ سیری بلیک فورس کے کچھ آدمی تو دیکھ بھال کر رہے ہیں لیکن تم بھی خیال رکھنا اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ بالی کمپ سے کیوں ہٹا ہے۔“

فریدی نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ ایک ملازم اندر داخل ہوا۔
 ”حمید کو بھیج دو۔“ فریدی نے کہا۔ ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حمید دروازے میں نظر آیا۔

”تم نے کیا کیا؟“ فریدی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
 ”معاملہ بالکل گول ہے۔ کو توالی سے معلوم ہوا کہ فقیر کی لاش سول ہسپتال روانہ کر دی گئی

تھی اور رسول ہسپتال والے کہتے ہیں کہ وہ طلباء کی مشق کے لئے میڈیکل کالج بھیج دی گئی تھی۔
 ”میڈیکل کالج والے کہا کہتے ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میڈیکل کالج والے کہتے ہیں کہ اس تاریخ کو تین لاوارث لاشیں انہیں موصول ہوئی تھیں اور اب یہ بتانا مشکل ہے کہ کس کے ٹکڑے کہاں دفن کئے گئے تھے۔ مگر ایک بات میری

سمجھ میں نہیں آتی۔ سول ہسپتال کا رجسٹر بتاتا ہے کہ اس تاریخ کو وہاں سے چار لاشیں میڈیکل

پُر اسرار سہاویہ

حمید خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر فریدی بھی خاموش ہو گیا۔

”ایک بات مجھے سمجھائیے۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”مسلماً براؤن آپ کی موجودگی ہی میں ہائی سرکل نائٹ کلب سے غائب ہو گئی تھی۔ لیکن آپ نے اُسکی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کی۔“

”پھر تمہارا اور میجر داراب کا عشق.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اس کی تو میں ہڈیاں توڑے بغیر نہیں رہوں گا۔“

”کیا تمہیں اب بھی اُس کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔“

”ٹریگر کو انگلی سے کھینچنے وقت زیادہ قوت نہیں صرف ہوتی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”اور پھانسی کا پھندا گلے میں پڑ جانے کے بعد تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا۔“

فریدی نے کہا۔

”پھانسی.....!“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”شاید پھانسی کا خوف بھی مجھے اس سے باز

نہ رکھ سکے۔“

”نہیں! تم فی الحال ایسا نہیں کر سکتے۔ میرا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”تو کیا وہ بھی اس کیس میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہت زیادہ حمید صاحب۔“

”آہا..... تب تو.....!“

”نہیں ٹھہرو..... یہ میرا شبہ ہے۔ فی الحال ہم اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں

کر سکتے۔“

”مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی آپ کا شبہ غلط نکلا۔“

”یہ اور بات ہے، لیکن مکمل شہادت فراہم کئے بغیر میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”ویسے مجھے یقین ہے کہ تمہیں میجر داراب کی ہڈیاں توڑنے کا موقع ضرور نصیب ہوگا۔“

فی الحال تم زغالی پر نظر رکھو۔“

”آخر آپ اُس بیچارے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ تو انتہائی

برخوردار قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ انتہائی خطرناک آدمی ہے۔ بہت عرصہ سے ہمارے یہاں

مقیم ہے اس لئے اب اُس میں تہذیب کے بھی کچھ آثار پائے جانے لگے ہیں ورنہ پہلے کبھی وہ

”غیر ضروری چیزوں کی پرواہ مجھے کبھی نہیں ہوتی۔“

”حالانکہ آپ پہلے ہی سے اُنکی ٹوہ میں رہے تھے کہ حمید اُسے کب اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔“

”ہاں! ہاں!..... تو کیا ہوا۔“

”خط استوا خط سرطان میں گھس گیا۔“ حمید جھلاہٹ میں ناچتا ہوا بولا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”اللہ کی مرضی.....!“ فریدی نے ایک طویل سانس لی اور مغموم لہجے میں بولا۔ ”مگر اس

صورت میں بھی تم میری نگرانی میں رہو گے۔ پاگل خانوں میں آج کل بڑی بد نظمی رہتی ہے۔“

”قبر میں بھی ہم دونوں لپٹ کر ہی سوئیں گے اور آپ وہاں بھی فاول فاول چلائیں

گے..... مجھے یقین ہے۔“

”خیر اب کام کی باتیں کرو.....!“

”میں کبھی بیکار باتیں نہیں کرتا۔“

”کل رات تم نے اس کار کا نمبر نوٹ کیا تھا۔“

”جی ہاں کیا تھا.....!“

”مجھے دو۔“

حمید نے جیب سے نوٹ بک نکالی۔ اُس سے وہ ورق پھاڑا جس پر کار کے نمبر تحریر تھے

اور اُسے فریدی کے سامنے ڈالتا ہوا بولا۔ ”آپ وہاں کیوں رکے تھے۔“

”اب تمہیں اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے کیونکہ میں وہاں سے صحیح سلامت واپس آ گیا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ میں زغالی ہی سے پوچھ لوں گا۔ مگر ایک بات تو صرف آپ ہی

بتا سکیں گے۔“

”پوچھو.....!“

”اس کیس کے سر پیر کا بھی کہیں پتہ ہے۔ بات سعید باہر کے بھائی سے شروع ہوئی

تھی۔ سعید باہر پر حملہ..... اُس کے کمپاؤنڈ میں عجیب و غریب نشانات کا پایا جانا۔ لہسی براؤن کا

کیس آپ پر ایک کتے کا حملہ۔ مگر اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا تعلق بھی

اسی کیس سے ہے پھر لہسی براؤن نقلی کا غائب ہو جانا۔“

ایک کنکھنے کتے کی طرح لوگوں پر جھپٹ پڑتا تھا۔ تہذیب نے اُسے مکاری بھی سکھا دی ہے۔ اچھا بس اب جاؤ۔ اس کی نگرانی بہت ضروری ہے۔ تم اگر بھول چوک بھی گئے تو پرواہ نہ کرنا۔ بہر حال مجرموں کو اس کا علم ہو جانا چاہئے کہ تم زغالی کی نگرانی کر رہے ہو۔“

اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“

”اب یہ بات مجرموں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہی کہ ہم زغالی میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔“
”تو کیا آپ کو یقین ہے کہ زغالی بھی مجرموں کا ساتھی ہے۔“

”ہاں کسی حد تک..... بہر حال اب جاؤ حمید..... فضول وقت نہ برباد کرو۔“

حمید چلا گیا۔ فریدی تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے فون کا ریسیور اٹھا کر کوٹوالی کے نمبر ڈائل کئے۔

”ہیلو.....!“ اُس نے کہا۔ انسپکٹر جگدیش کی آواز سنائی دی۔

”ایک منٹ توقف کیجئے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

پھر جلد ہی دوسری طرف سے جگدیش کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو.....! جگدیش میں فریدی ہوں۔ ذرا دیکھو تو آج کسی مسز تنویر نے کوئی رپورٹ تو نہیں درج کرائی ہے۔“

”اوہ جناب! اُس عورت نے تو پوری کوٹوالی کو ہلا کر رکھ دیا ہے مگر آپ..... کیا قصہ ہے۔“

”رپورٹ کیا ہے جگدیش.....!“

”کل رات سے اس کا لڑکا عدنان اور اُس کے چاروں باڈی گارڈ غائب ہیں۔ اس کا خیال ہے باڈی گارڈوں نے اُسے اغوا کیا ہے اور اب وہ تنویر سے کسی بھاری رقم کا مطالبہ کریں گے۔ اُس نے اپنے لڑکے اور باڈی گارڈز کی تصویریں بھی دیں ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ شہر کے چار بد معاشوں کی تصویریں ہیں کئی بار کے سزایاب بد معاش.....!“

”اوہ..... ذرا مجھے بھی تو ان کے نام بتاؤ۔“

جگدیش نام بتاتا رہا اور فریدی ایک کاغذ پر نوٹ کرتا گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”یہ لوگ تو واقعی اُس سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔“

”مگر.....!“ جگدیش نے کہا۔ ”تنویر کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ انہیں ایک پائی بھی نہ دے گی خواہ اُسے اپنے بیٹے ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں۔ بڑی شاندار عورت ہے جناب..... ایس۔ پی صاحب اُس سے.....!“

”ہیلو.....!“

”جی ہاں.....!“ جگدیش ہنستا ہوا بولا۔ ”میں ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا کہ کہیں کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ ایس۔ پی صاحب اُس سے گفتگو کرتے وقت ہکلا رہے تھے۔ بڑی شاندار عورت ہے۔ عمر چالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ مگر صحت بڑی شاندار ہے۔ بڑا شاندار جسم ہے۔“

”سب کچھ شاندار.....!“ فریدی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”اوہ..... کیا آپ اُس سے کبھی نہیں ملے۔“

”نہیں..... صرف نام سننا رہا ہوں۔“

”ضرور ملے جناب..... آپ اُسے بے حد پسند کریں گے۔“

”ہاں..... پسند ہی کرنے کے لئے میں اس سے ضرور ملوں گا۔ تم مطمئن رہو۔“

”میں کیا بتاؤں..... میں تو اُس سے آنکھیں ملا کر گفتگو نہیں کر سکا۔“ جگدیش بولا۔ لیکن

فریدی نے برا سامنہ بنا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب وہ پھر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ایک بار اُس نے پھر ریسیور اٹھایا اور اپنے ڈی۔ آئی۔ جی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ڈی۔ آئی۔ جی گھر ہی پر موجود تھا۔ فریدی نے اُس سے تنویر کی رپورٹ کے متعلق بتا کر استدعا کی کہ وہ تنویر والا کیس اپنے محکمے میں ٹرانسفر کرائے۔

”ابھی یہ کیسے ممکن ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”یہ بہت ضروری ہے جناب۔ براہ راست میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔“

”کیوں..... میں نہیں سمجھا۔“

”مجھ پر ایک زہریلے کتے نے حملہ کیا تھا۔ بعض حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں یہ نہیں سوچ سکتا کہ وہ محض اتفاق تھا۔“

”ہاں..... حالات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کسی موٹر سائیکل سوار نے تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔“

”جی ہاں..... اور اس سازش کی جڑیں تویر کی موجودہ رپورٹ میں ملتی ہیں۔ میں نے یہی اندازہ کیا ہے۔“

”اوہو..... کیا قصہ ہے۔!“

”قصہ تو ابھی خود میرے ذہن میں بھی صاف نہیں ہے لیکن آپ مجھ پر اعتماد کیجئے۔“

”اچھا میں کیسے منتقل کرالوں گا۔ تم مطمئن رہو۔“

”آج ہی جناب۔“

”اچھا بابا..... ایک طرف تم کان کھا رہے ہو اور دوسری طرف میرا نواسا۔“

”میں بھی تو آپ کا بچہ ہوں آخر۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”مگر ضدی..... بچے..... اچھا..... اور کچھ.....!“

”نہیں جناب..... بس اتنا ہی شکریہ۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو جانے پر فریدی نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ لیکن ریسیور رکھتے ہی گھٹی بجی۔

”ہیلو.....!“ اس نے دوبارہ ریسیور اٹھالیا۔

”میں دیکھا بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔“

”ٹھیک ہوں۔“

”زخم..... کیسے ہیں۔“

”اب زیادہ تکلیف نہیں ہے۔“

”مجھے بڑی بے چینی ہے۔“

”کیوں.....!“

”وہ دیکھئے..... میں سوچتی ہوں..... آپ کے زخموں میں تکلیف ہوگی اور مجھے نیند نہیں

آتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ زخم میری کلائی پر ہوں۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ فریدی کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یقیناً وہ کتا کوئی خبیث روح تھی۔ تب ہی تو تم ایسا محسوس کر رہی ہو۔“

”میرا مطلب ہے۔“

”کیا مطلب ہے۔“

”وہ..... وہ..... دیکھئے..... خدا کرے آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں۔ کیا میں آپ کو

دیکھنے کے لئے آ سکتی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ آج کل کسی سے نہیں ملتے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میری ذہنی حالت اچھی نہیں ہے۔ زہر کا اثر کچھ نہ کچھ ذہن پر بھی ہوا

ہے۔ کبھی کبھی بڑی طرح بہک جاتا ہوں۔“

”خدا رحم کرے۔“

”اور کچھ.....!“ فریدی نے پوچھا۔

”جی نہیں..... بس خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔“

”شکریہ.....!“ فریدی نے کہا اور برا سامنے بنا کر فون رکھ دیا۔

اُسے بعض اوقات اپنے منگے پر غصہ آنے لگتا۔ خواہ مخواہ ایک لیڈی انسپکٹر بھی مہیا کر لی حالانکہ اس کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

وہ سگار سلگا کر ایک آرام کرسی میں نیم دراز ہو گیا۔

بمشکل تمام دو یا تین منٹ گزرے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ فریدی نے اٹھ کر

ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے حمید کی آواز سنائی دی۔

”میں نگرانی کر رہا ہوں جناب۔“

”وہ تو مجھے معلوم تھا۔ اتنی سی بات کے لئے فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ فریدی نے

جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر وہ میرے سوالات کا جواب نہ دے تو میں کیا کروں۔“

”سوالات کرنے کو تم سے کس نے کہا تھا۔“ فریدی کی آواز تیز ہو گئی۔

”میں اُس سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ کواس کے جارہے ہو۔“

”اچھا جناب.....!“ حمید نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ”میں تو اُس سے صرف یہ پوچھتا چاہتا ہوں کہ تیری کھوپڑی میں سوراخ ہو گیا مگر وہ میری بات کا جواب ہی نہیں دیتا۔ اس سے یہی سوال کرنے کے لئے بے شمار آدمی اکٹھا ہو گئے ہیں۔“

”اوہ..... تو زغالی قتل کر دیا گیا۔“

”جناب والا.....!“

”فوراً واپس آ جاؤ..... اب وہاں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا میں یہ نہ معلوم کروں کہ اس کا قتل کن حالات میں ہوا۔“

”نہیں..... مجھے رپورٹ مل جائے گی۔ تم واپس آ جاؤ۔“

فریدی نے ریسپور رکھ کر بجھا ہوا سگار سلگایا اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ لیکن اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے پہلے ہی سے علم رہا ہو کہ زغالی مار ڈالا جائے گا۔

جلد ہی پھر فون کی گھنٹی بجی۔ فریدی نے ریسپور اٹھا لیا۔ لیکن اس بار وہ ایک عجیب و غریب زبان میں گفتگو کر رہا تھا، بس ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی زبان مل نہیں رہی ہے بلکہ کنکروں اور پتھر کے ٹکڑوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چل رہا ہو۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ کبھی کبھی وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے بولنے والے کی بات سننے لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پھر گہرے فکر کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

ریسپور رکھتے وقت اُس نے ایک طویل سانس لی اور دروازے کی طرف مڑا۔ حمید بڑی دیر سے دروازے میں خاموش کھڑا اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں۔“ حمید نے گہرائے ہوئے لہجے میں پوچھا اور فریدی ہنس پڑا۔ حمید نے کچھ ایسے انداز میں یہ جملہ کہا تھا کہ اُسے جیسے فریدی کے صحیح الدماغ ہونے میں شبہ ہو۔

”بیٹھو.....!“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”میں تمہیں بتاؤں کہ اُس کی موت کیسے واقع ہوئی۔“

حمید بیٹھ گیا۔ فریدی چند لمحے خاموش ہو کر بولا۔ ”ایک طویل قامت برقعہ پوش عورت شاہپور بلڈنگ کے ساتویں فلیٹ کے سامنے رکی۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے سائینسٹر اور یو ایلور نکالا اور پھر بقول تمہارے زغالی کی کھوپڑی میں سوراخ ہو گیا۔ شاہپور بلڈنگ میں دونوں طرف زینے ہیں اور ساتواں فلیٹ دوسری منزل پر ہے۔ نیچے سے سامنے کے فلیٹوں کے دروازے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں تو زغالی کو ختم کرنے کے بعد وہ پچھلے زینوں سے نیچے اتر گئی اور جاتے وقت اپنا برقعہ زینوں ہی پر پھینک گئی تھی۔“

”تب تو وہ گرفتار بھی ہو چکی ہوگی۔“

”کیوں..... نہیں تو..... وہ نکل گئی۔“

”اور آپ کی بلیک فورس کے جیالے منہ دیکھتے کر رہ گئے۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں وہ پیارے کچھ سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔ وہ تو تھوڑی دیر بعد اُبلز ہونے پر انہیں قتل کا علم ہوا۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ وہ گرفتار کر لی گئی ہوتی۔ فلیٹ کا دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا کسی پڑوسی کی نظر لاش پر پڑ گئی اور اس نے ہسٹریا کی مریض کی طرح چیخنا شروع کر دیا۔ بلیک فورس والے نیچے تھے اور اس فلیٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ بہر حال اُس آدمی کی چیخیں سن کر ہی وہ اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔“

”تب پھر آپ وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کوئی عورت ہی تھی۔ برقعہ میں مرد بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”برقعے کے ساتھ عورت ہی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ویسے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عورت ہی تھی۔ بہر حال بلیک فورس حرکت میں آ گئی ہے۔“

”زغالی کیوں مارا گیا.....؟“ حمید نے پوچھا۔

”زغالی.....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زغالی اُن نشانات کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتا تھا۔ خیر ختم کرو۔ بالی کمپ کے بیشتر لوگ آج چین کی نیند سوئیں گے۔ زغالی ایسا ہی آدمی تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر سرکاری طور پر اُس کی لاش دفن نہ کی گئی تو جنازہ یونہی پڑا رہ جائے گا۔ کیونکہ اس کے ساتھی اُس

سے صرف ڈرتے تھے۔ انہیں اس سے محبت نہیں تھی۔“

فریدی قموڑی دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں صبح سے صرف دوسروں کی کالز ریسیور کرتا رہا ہوں۔ اب ایک فون میں بھی کروں گا۔“ اس نے کسی کے نمبر ڈائل کئے۔ ”ہیلو..... کون سعید باہر صاحب۔ میں فریدی ہوں۔“ فریدی کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ”بھاگئے..... جتنی جلد ممکن ہو سکے..... وہ عمارت چھوڑ دیجئے۔ آپ بہت بڑے خطرے میں ہیں۔“ پھر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر فریدی نے ریسیور رکھ دیا۔

”کیا مطلب.....!“ حمید بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو..... بیٹھو..... اس کی فکر نہ کرو۔“

”آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں گے۔“

فریدی نے آرام کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

حمید سارا دن گھر میں رہا۔ آج اتوار تھا اور دوپہر ہی سے مطلع ابر آلود ہو گیا تھا اس لئے وہ باہر نہیں گیا۔

وہ دن بھر فریدی کو فون کرتے یا کالیں ریسیور کرتے دیکھتا رہا۔ حمید کے مکرر استفسار پر اس نے اتنا ہی کہا کہ وہ بستر مرگ پر بھی کام کر سکتا ہے۔

شام کو اس نے خاص طور پر نوکروں کو ہدایت دی کہ کوئی کتا کھانا نہ چھوڑا جائے۔ حمید کو اس پر بھی حیرت ہوئی لیکن اب اس نے کچھ نہ پوچھنے کی قسم کھالی تھی۔

ایک بار جب فریدی لیبارٹری میں تھا۔ حمید نے اس کی ایک کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے بولنے والی کوئی عورت تھی۔ یہ بات ذرا دیر میں سمجھ آئی کہ بولنے والی لیڈی انسپکٹر ریکھا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

”فریدی صاحب کا انتقال ہو گیا۔“ حمید نے بڑی دردناک آواز میں کہا۔

”نہیں.....!“ ریکھا اتنے زور سے چیختی کہ ریسیور جھنجھٹا اٹھا۔

”یہاں کفن دفن کا انتظام ہو رہا ہے لیکن انہوں نے مرتے وقت کہا تھا کہ ریکھا کو میرے ساتھ ہی دفن کرنا۔“

”بڑے کیئے ہیں آپ۔“ ریکھا جھلا گئی۔ ”اس قسم کے فضول مذاق کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔ بتائیے فریدی صاحب کیسے ہیں۔“

”بہن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سو رہے ہوں۔ عرصہ سے اس قسم کی بارونق لاش دیکھنے کی تنہا تھی۔“

”شٹ اپ.....!“ ریکھا حلق کے بل چیختی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر اندھیرا پھیلنے لگا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے فضا تاروں کی روشنی سے بھی محروم ہو گئی تھی۔

نوکروں کے لئے فریدی کا سخت آرڈر تھا کہ وہ رات کے کسی بھی حصے میں اپنے کوارٹروں سے باہر قدم نہ نکالیں، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے صرف ایک کتا کپاؤنڈ میں کھلا رہنے دیا۔

”اور اب..... ہم لوگ۔“ اس نے حمید سے کہا۔ ”یہ رات مختلف قسم کی تفریحات میں بسر کریں گے۔ اگر تم سونا چاہتے ہو تو یہیں ایک آرام کرسی پر سو بھی سکتے ہو۔“

وہ اوپری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ جس کی کھڑکیاں عقبی پارک کی طرف کھلتی تھیں اور یہ اسلحہ کا کمرہ تھا۔

حمید نے ان سارے انتظامات کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ وہ پکچر پوسٹ اور فوٹو پلے پن آپ کے بہت مسائل اٹھالایا تھا اور اب ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ سارے نوکر کوارٹروں میں تھے۔ اس لئے اس کمرے میں اسٹوجل رہا تھا اور اس پر کافی کا پانی چڑھا ہوا تھا۔

تقریباً گیارہ بجے فریدی نے کمرے کی روشنی گل کردی اور حمید میز پر رسالہ پختا ہوا بڑبڑایا۔ ”یہاں تو چھپر بھی نہیں ہیں کہ اندھیرے میں ان کی سارنگی ہی سے دل بہلتا۔“

”توقع ہے کہ دل بہلنے کا کچھ نہ کچھ سامان مہیا ہی ہو جائے۔“ فریدی بولا۔

لیکن حمید نے اب بھی کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن ایسے میں نیند کہاں۔ کچھ بھی ہو۔ فریدی اپنا وقت برباد نہیں کرتا تھا۔ اب تمام تیاریوں کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور تھا۔

پتہ نہیں وہ کب تک آنکھیں بند کئے آرام کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا رہا پھر اچانک وہ چونک پڑا۔ کیونکہ فریدی اُس کا داہنا شانہ دبا رہا تھا۔

”ادھر..... وہ دیکھو..... عقبی پارک کی دیوار پر..... سامنے!“ اُس نے آہستہ سے کہا۔
کافی گہرا اندھیرا تھا۔ لیکن دیوار کے دھندلے سے آثار تو نظر ہی آرہے تھے۔ حمید نے دیوار پر ایک گول منول سا سایہ دیکھا اور پھر اُس سائے نے زمین پر چھلاگ لگائی۔ ساتھ ہی ایک تیز قسم کی غراہٹ سنائی دی اور وہ کسی کتے ہی کی غراہٹ تھی۔
”یہ میرے کسی کتے کی آواز نہیں ہو سکتی۔“ فریدی نے کہا اور میز پر پڑی ہوئی رائفل اٹھالی مگر نیچے زمین پر جھانپوں اور درختوں کی وجہ سے گہری تاریکی تھی۔

اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے دو کتے آپس میں لڑ پڑے ہوں۔ مگر آواز صرف ایک ہی کی سنائی دے رہی تھی اور فریدی برابر یہ کہے جا رہا تھا کہ وہ اس کے کسی کتے کی آواز نہیں ہے..... پھر..... ایک بڑی لمبی آواز سنائی دی اور سناٹا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کتے کی آخری چیخ رہی ہو۔

بڑا سا گول منول سایہ اب درختوں کے نیچے سے نکل کر کھلے میں آ گیا تھا۔ اچانک فریدی کی رائفل سے ایک شعلہ نکلا اور وہ دس پندرہ فٹ اوپر اچھل گیا۔ مگر اس کے بعد پھر کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں گیا۔

”افسوس.....!“ فریدی کی بھرائی ہوئی آواز گھرے میں گونجی اور حمید کی نظر پارک کی دیوار کی طرف اٹھ گئی۔ گول منول سایہ گویا اڑتا ہوا دیوار پار کر رہا تھا۔ فریدی نے پھر فار کیا۔ مگر اس فار کا انجام نہ معلوم ہو سکا۔

دوسرے ہی لمحے میں فریدی حمید کو کھینچتا ہوا زینے طے کر رہا تھا۔ وہ عقبی پارک میں پہنچ گئے۔ ٹارچ کی روشنی اندھیرے میں آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھی۔

حمید کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دوسرا کتا سیاہ رنگ کا تھا اور اس کے سر پر سفید دھاریاں تھیں جسم گرے ہاؤنڈ کا سا تھا۔

کسی نے اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں چیر دی تھیں۔

قاسم اور سایہ

فریدی دیوار کی طرف جھپٹا۔ حمید بھی اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی کے منہ سے ایک تیز آواز نکلی وہ ٹارچ کی روشنی میں جھکا ہوا زمین پر کچھ دیکھ رہا تھا۔
”حمید.....!“ دفعتاً اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”یہ تو ویسے ہی نشانات ہیں۔“

حمید بھی جھک پڑا۔ یہ وہی حیرت انگیز نشانات تھے جو سعید باہر کی کوشی کی کمپاؤنڈ میں پائے گئے تھے اور جن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے فریدی نے زغالی سے مدد لینے کی کوشش کی تھی۔

دیوار کے نیچے نرم زمین تھی۔ اس لئے نشانات بہت زیادہ واضح تھے۔
”میرے خدا.....!“ حمید بڑبڑایا۔ ”وہ کیا بلا تھی۔ میں نے اُسے اڑتے دیکھا تھا۔ وہ دیوار سے دو یا تین گز بلند تھا۔“

”افسوس ہے کہ میرے دونوں فار خالی گئے۔“
”جب وہ دیوار سے زمین پر آئی تھی۔“ حمید نے کہا۔ ”کیا وہ لڑھکتی ہوئی ایک بہت بڑی گیند نہیں معلوم ہو رہی تھی۔“

”حمید کو تو قلع تھی کہ اب فریدی بھاگ کر دیوار کی پشت پر جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ عمارت کی طرف چل پڑا۔“

”ایسے ہی کسی کتے نے آپ پر حملہ کیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔
”ہاں..... یہ لاش تو اسی کتے کی معلوم ہوتی ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ یہ زندہ میرے ہاتھ نہ آ سکا۔“

اندر آ کر فریدی نے کسی کے نمبر ڈائل کئے۔ ریسپور کان سے لگائے رہا۔ پھر ڈس کنکٹ

کر کے دوبارہ نمبر ڈائل کئے اور فوراً ہی پھر ڈس کنکٹ کر دیا۔ اس طرح اس نے لگاتار تقریباً پچیس بار وہی نمبر ڈائل کئے اور وہ نمبر حمید کے ذہن نشین ہو گئے۔ بہر حال اس کے بعد فریدی نے ریسپور کریڈل میں ڈال دیا۔

”آپ کس سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔“

”کسی سے بھی نہیں۔ میں تو صرف ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا، جو سو فیصدی کامیاب رہا۔“

”کیا کامیاب رہا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ابھی تک اپنا وقت برباد کیا ہے۔ آپ کی جگہ اگر میں ہوتا تو دیوار کے اس طرف پہنچنے میں دیر نہ کرتا۔“

”تم پر کیا منحصر ہے۔“ فریدی نے اسامہ بنا کر بولا۔ ”شیخ تھو اور میر جن بھی یہی کرتے۔“
”خیر..... خیر.....“ حمید نے بیزاری سے کہا۔ ”آپ کے سب تجربات ختم ہو گئے یا ابھی کچھ باقی ہیں۔“

”اب تم سو سکتے ہو۔ مجھے توقع ہے کہ باقی رات آرام سے گزرے گی۔“

فریدی کمرے سے چلا گیا اور حمید بڑی تیزی سے ٹیلی فون ڈائریکٹری پر جھپٹ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اس نمبر کی تلاش میں اور اٹ رہا تھا، جو کچھ دیر قبل بار بار ڈائل کیا گیا تھا۔

مگر نمبر سے پتہ معلوم کر لینا آسان کام نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جھلا کر ڈائریکٹری میز پر بیٹھ دی اور پھر اسے اپنی عقل پر غصہ آنے لگا۔ آخر اتنی دیر تک ڈائریکٹری میں سرکھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ نمبر کے ذریعہ پتہ تو انکواری سے بھی معلوم کیا جاسکتا تھا۔ ٹیلی فون انکواری میں کئی لڑکیاں اس کی شناسا بھی تھیں۔

اس نے انکواری کو رنگ کیا۔ اتفاق سے لڑکی جان پہچان والی ہی نکلی اور حمید کو جلد ہی مطلوبہ پتہ مل گیا۔ لیکن جب وہ پتہ ایک کانڈ پر نوٹ کر کے ریسپور کریڈل میں رکھ رہا تھا اس نے فریدی کی آواز سنی۔

”لیکن تم کوئی حماقت نہیں کرو گے۔“

حمید دروازے کی طرف مڑا۔ فریدی سامنے کھڑا اس کا سر لگا رہا تھا۔

”آپ نے مسز تنویر کے نمبر کیوں ڈائل کئے تھے۔“

”بس یونہی..... میں نے سوچا کہ تمہیں کسی شاندار عورت کی سرپرستی میں دے دیا جائے۔“

”شکریہ..... مجھے آپ ہی کے زیر سرپرستی ہر قسم کا مزہ آ جاتا ہے۔ آپ مزید تکلیف نہ کریں۔“

”تم ادھر کا رخ بھی نہیں کرو گے سمجھے۔“

”مجھے بوڑھی عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی مسز تنویر ہے۔ تنویر

ٹیکسٹائل ملز اور تنویر آرن در کس کی مالکہ۔“

”ہاں وہی..... کیا تم اس سے کبھی مل چکے ہو۔“

”اگر وہ بائیس اور تیس کے درمیان میں ہوگی تو یقیناً کبھی نہ کبھی مل چکا ہوں گا۔“

”اس کا لڑکا تمہاری عمر کا ہوگا۔“

”اور اس سے ایک آدھ چھوٹی کوئی لڑکی ہوگی۔ میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں۔“

”تم ہار جاؤ گے۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”مگر وہ خوشخوار کتا آج بھی تنہا نہ رہا ہوگا۔“

آپ نے اس تجربے کے چکر میں اسے نکل جانے دیا۔“

”حمید صاحب! مجرم میری جیب میں رکھے ہوئے ہیں۔ جس وقت چاہوں ہتھکڑیاں

لگا دوں۔ مگر میں فی الحال ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ بس دو چار دن اور ٹھہر جاؤ تا کہ جو کس باقی رہ گئی

ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔“

”آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں گویا یہ کس میری شادی سے پوری ہوگی۔“

”مثلاً آپ.....“ فریدی نے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔ لیکن حمید فوراً ہی بول پڑا۔

”تو پھر آپ اس گول مٹول سائے کے متعلق بھی جانتے ہوں گے۔“

”نہیں میں نہیں جانتا کہ وہ کیا بلا ہے..... یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہمارے ہی لئے آئی

تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی کتے کا تعاقب کرتی ہوئی یہاں آئی ہو۔ رہا کتا تو وہ ایک بار پہلے

بھی مجھ پر حملہ کر چکا ہے۔ ممکن ہے آج بھی اسے یہاں اسی نیت سے لایا گیا ہو۔“

”تو کیا..... وہ سایہ اس کتے کا تعاقب بھی کر سکتا ہے۔“

”خدا جانے!“ فریدی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہیں نیند نہیں آرہی ہے۔“

حمید بھنا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ بستر پر جانے سے پہلے ایک پائپ پینے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ پُر اسرار سایہ اب بھی اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ وہ کوئی ہماری بھر کم مگر ایسی چیز تھی جو گیند کی طرح لڑھک سکتی تھی اور نینس کی گیند کی طرح اچھل بھی سکتی تھی۔ پہلے فائر پر تو وہ حقیقتاً کسی ایسی نینس بال ہی کی طرح اچھل سکتی تھی جسے پوری قوت سے زمین پر پٹخ دیا گیا ہو۔ حمید دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا پھر ذہنی رد اس خطرناک کتے کی طرف بہک گئی۔ اس نے بھی شاید زندگی میں پہلی بار اس قسم کا کوئی کتا دیکھا تھا مگر کیا اسی خوفناک سائے نے اس کی ٹانگیں چیر ڈالی تھیں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ اگر یہ سایہ وہی تھا جس کے پیروں کے نشانات سعید بابر کی کھڑکی کے نیچے ملے تھے تو اس کتے سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اسی کتے نے فریدی پر حملہ کیا تھا۔ مگر سائے کا حملہ سعید بابر کے لئے تھا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ دونوں کے راستے الگ الگ تھے پھر ان دونوں کا ٹکراؤ کیا معنی رکھتا ہے۔

حمید کو جلد ہی نیند نہ آ سکی۔ وہ بستر پر پڑا جاگتا رہا۔ اُسے مجرموں سے زیادہ فریدی پُر اسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت نہ تو اس نے کتے کی لاش کی پرواہ کی تھی اور نہ یہی معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ پُر اسرار سایہ کہاں سے آیا تھا اور کدھر گیا تھا۔ اس کے برخلاف وہ فون پر تنویر کے نمبر ڈائل کرتا رہا تھا۔

اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی اور وہ بیساختہ اچھل پڑا۔ اس عمارت میں تین فون تھے۔ ایک فریدی کی خواب گاہ میں رہتا تھا۔ دوسرا حمید کی خواب گاہ میں اور تیسرا لائبریری میں۔

”ہیلو.....! کیا سو گئے۔“ اس نے فریدی کی آواز سنی۔

”آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔“ حمید نے بوکھلا کر پوچھا۔

”بستر سے۔“

”اور میں اہرام مصر پر ہوں۔“

”سنو مذاق نہیں۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے۔“

”بستر پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں..... یہی نا۔“ حمید جھلا گیا۔

”اس وقت نہیں صبح.....!“

”تو کیا صبح نہ ہوتی..... بتائیے کیا کام ہے۔“

”صبح ضرور ہوگی.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی ”مگر اس کام کی شروعات بستر پر

پڑے ہی پڑے ہو سکتی ہے۔“

”ابھی کچھ کہہ دوں گا تو.....!“

”شٹ اپ..... میری سنو..... کسی طرح قاسم اور سعید بابر کو لڑا دو۔“

”بڑے موڈ میں ہیں آپ.....!“

”آ..... ہاں..... تم نے مجھے راحلہ کے متعلق بتایا تھا۔ بس لڑا دو..... دونوں کو..... تمہاری

تفریق ہو جائے گی۔“

”آ خر آپ ان دونوں کو کیوں لڑانا چاہتے ہیں۔“

”ایک تجربہ کر رہا ہوں۔“

تجربے کے نام پر حمید جھلا گیا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

”گردن ریت ڈالنے میری..... وجہ پوچھوں تو فرمائیے ایک تجربہ کر رہا ہوں۔“

”قاسم کی خواب گاہ میں فون ضرور ہوگا۔“ فریدی نے کہا۔

”ہوگا..... مجھے پتہ نہیں۔“

”تم اس کے نمبر ڈائل کرو..... کوئی دوسرا بولے تو کہو قاسم سے ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ

سورہا ہوگا۔ اٹھا بھی تو چھڑا کھانے کے سے انداز میں فون پر آئے گا۔ تم کہنا کہ تم سعید بابر بول

رہے ہو اور پھر راحلہ کے متعلق کچھ پوچھ بیٹھنا۔“

”پوچھنا کا تصور کر کے حمید بے تحاشہ فیس پڑا اور دوسری طرف سے آواز آئی۔ سمجھ گئے نا۔“

”میں سمجھ گیا..... لیکن آپ وجہ نہیں بتائیں گے کیوں؟“

”حمید سچ پوچھو تو ابھی یہ سارے معاملات تجرباتی دور میں ہیں۔ ویسے دو ایک مجرم میری

نظر میں ضرور ہیں مگر بیکار۔ مکمل شہادت ملے بغیر میں ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ

وہ سب کافی باعزت اور اونچی پوزیشن کے لوگ ہیں۔ خیر اچھا..... اب تم اپنا تجربہ شروع کرو۔“

حمید فون کا سلسلہ منقطع کر کے سوچ میں پڑ گیا۔ ضروری نہیں کہ فون خواب گاہ میں ہو اور قاسم کے نوکر یا گھر کے افراد شاید ہی اسے جگانے کی ہمت کر سکیں۔ پھر اچانک اُسے یاد آیا کہ اس نے ایک بار دو تین ٹیلی فون آپریٹر لڑکیوں کا تعارف قاسم سے کرایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں فون کرتا ہو۔ دن کو بیوی کی وجہ سے دشواری ہوتی ہوگی اس لئے وہ رات کو ضرور کوشش کرتا ہوگا۔ وہ دونوں الگ الگ کمرے میں سوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے آج کل ایک فون خواب گاہ میں رکھ چھوڑا ہو۔

اس نے قاسم کو فون کرنے سے پہلے ایک بار پھر فریدی سے رابطہ قائم کیا۔

”ہیلو..... میں ہوں..... جی ہاں..... مگر سعید باہر کو تو آپ نے کنکس لین سے بھگا دیا ہے۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔“ فریدی بولا۔ ”وہ ابھی تک وہیں جما ہوا ہے۔ میرے کہنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بعد کو مجھے فون کیا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ قطعی کسی سے مرعوب یا خائف نہیں ہے۔ اگر اس کا بھائی یہاں ایڑیاں رگڑ کر مرا ہے تو میں بھی یہیں مر جاؤں گا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایسے بزدلوں سے مرعوب نہیں ہو سکتا جو ایک اپانچ کی رقم ہضم کر کے اسے بھیگ مانگنے پر مجبور کرتے رہے۔ اب میں تمہیں بتاؤں کہ قاسم کی وجہ سے اُسے وہ کٹھی چھوڑنی ہی پڑے گی۔“

”آخر آپ اُس بیچارے کو وہاں سے کیوں نکلوانا چاہتے ہیں۔“

”یہ ابھی نہ پوچھو..... بس دیکھتے جاؤ۔“

فریدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب حمید قاسم کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ اُسے تقریباً پانچ یا چھ بار نمبر ڈائل کرنے پڑے۔ پھر دوسری طرف سے ریسپور انٹرنے کی آواز آئی۔

”ہالو..... قون..... کون ہے۔“ قاسم کی دھاڑ سنائی دی۔

”قاسم صاحب.....!“ حمید نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں قاسم صاحب..... تم کون ہو..... یہ بھی قوی حرکت ہے۔“

”کیا راحلہ جاگ رہی ہیں۔“

”اے تم کون ہو.....!“ قاسم دھاڑا۔

”سعید باہر.....!“ حمید نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا.....!“ چند لمحے خاموشی رہی پھر حمید کے ”ہیلو“ کہنے پر قاسم پھٹ پڑا۔ ”اے اے او

سعید باہر کے بچے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے..... سالے.....!“

”ذرا تمیز سے گفتگو کیجئے۔“ حمید نے لہجے میں غصیلان پن پیدا کیا۔

”تیری تمیز کی دم..... یہ راحلہ کیا تیری ممانی لگتی ہے۔“

”قاسم صاحب! آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔“

”اے اے میں تیری بوٹیاں اڑا دوں گا۔ بڑا افریقہ کا بچہ۔ خبردار جواب کبھی ادھر کا رخ کیا۔

مار مار کر بھس بھروں گا۔“

”میں آپ کی دھجیاں اڑا دوں گا۔ آپ ہیں کس خیال میں۔“ حمید نے کہا۔ ”راحلہ

میری ہے اور ہمیشہ میری رہے گی۔“

”تیرے باپ کی ہے راحلہ..... اچھا ٹھہرو..... سوئور کے بچے! میں وہیں تمہارے گھر پر آتا

ہوں..... پھر دیکھوں گا کہ راحلہ کس کی ہے۔“

”آپ میرے گھر پر آ کر اپنی موت کو دعوت دیں گے۔“

”اچھا..... اچھا.....!“

”راحلہ کو ساتھ لیتے آئیے گا۔“ حمید نے کہا۔

”خرموش.....!“ قاسم چنگھاڑا۔ ”سوئور کے بچے..... اے میں سچ مچ آ رہا ہوں۔ اسی

وقت پھر دیکھوں گا کہ تجھ میں کتنا دم ہے۔“

”دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حمید پیٹ دبائے ہوئے بے تحاشہ قہقہے لگا رہا

تھا۔ اُس نے پھر فریدی سے گفتگو کرنے کے لئے ریسپور اٹھایا۔

”کیا بات ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”وہ ابھی اور اسی وقت سعید باہر کی ہڈیاں توڑنے جا رہا ہے۔“

”خوب.....!“

”میں بھی جا رہا ہوں۔“

”تم کیا کرو گے۔“

”واہ..... اصل تفریق تو وہیں ہوگی..... اچھا میں چلا۔“

”ٹھہرو.....! سنو وہ دونوں تمہیں دیکھنے نہ پائیں۔“

”آپ مطمئن رہیں.....!“ حمید نے کہا۔ ریسور کریڈل میں ڈالا اور بڑی تیزی سے لباس تبدیل کرنے لگا۔ کمرے سے باہر نکلے وقت اس کے جسم پر سیاہ چٹون اور چمڑے کی جیکٹ تھی۔

اُسے کچھ اچھی طرح یاد نہیں کہ اُس نے گھر سے سعید کی کوشی تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ کار ایک گلی میں کھڑی کرک

وہ کوشی کی پشت پر پہنچ گیا۔ کوشی کے گرد قد آدم چہار دیواری تھی۔ حمید بڑی احتیاط سے اس پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔

لیکن آج ایک حیرت انگیز بات اس نے مارک کی تھی۔ کوشی کی کمپاؤنڈ کا پھانک کھلا ہوا تھا اور عمارت کی بعض کھڑکیوں میں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

حمید پام کے گملوں کی اوٹ میں رک گیا۔ یہاں سے پھانک صاف نظر آتا تھا۔ اچانک اُسے قاسم کی آواز سنائی دی، جو شاید پھانک میں داخل ہونے سے پہلے ہی دھاڑنے لگا۔

”ابے! اوسعد بابر کے بچے..... میں آ گیا..... نکل تو باہر۔“

پھر پھانک میں اس کے پہاڑ جیسے جسم کا دھندلا سا سایہ نظر آیا۔ وہ پورچ کی طرف بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی مغلطات کا طوفان امنڈا ہوا تھا۔ اچانک حمید کے جسم کے سارے روٹنگے کھڑے ہو گئے کیونکہ قاسم کے پیچھے بھی ایک سایہ تھا۔ وہی گول مثل سا سایہ جو تھوڑی دیر قبل فریدی کی کوشی میں نظر آیا تھا۔ وہی تھا..... سو فیصدی وہی تھا۔

حمید اُسے محض واہمہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ زمین پر کسی بڑی سی گیند کی طرح لڑھک رہا تھا اور قاسم شاید اس کی موجودگی سے لاعلم تھا۔ دونوں میں بمشکل تمام دس گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔

حمید بوکھلا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فائر کر دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لہذا اس نے ریوالور نکال کر پے در پے تین فائر جھونک دیئے۔

”ہت تیرے کی.....!“ اُس نے قاسم کی چنگھاڑ سنی۔ ”سالے بزدل۔“

حمید نے اس گول مثل سائے پر فائر کئے تھے اور اُسے اچھل کر دوبارہ زمین پر گرتے دیکھا تھا مگر پھر اُس کے بعد وہ نظر نہیں آیا اور قاسم بھی غدار.....“

”قاسم.....!“ حمید نے اُسے آواز دی۔

”تقی..... قون.....!“ قریب ہی سے کپکپاتی ہوئی آواز آئی۔

ساتھ ہی کسی نے اوپری منزل کی ایک کھڑکی سے آوازوں کی سمت ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

”حمید بھائی.....!“ قاسم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شاید ابھی تک زمین پر چپٹ پڑا رہا تھا۔

پھر وہ اوپری منزل والی کھڑکی کی طرف ہاتھ ہلا کر چیخا۔

”آؤ سالے..... نیچے آؤ۔ تم نے ایک پولیس آفیسر کی موجودگی میں مجھ پر گولیاں چلائی ہیں۔“

”کون ہے.....!“ اوپر سے آواز آئی۔

”میں تمہارا باپ..... نیچے آؤ.....!“ قاسم نے لاکرا۔

حمید بوکھلا گیا۔ یہ نئی مصیبت تھی۔ قاسم کو کنٹرول کرنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ کیا سوچ کر

آیا تھا اور کیا ہو گیا؟ فریدی نے اُس سے کہا تھا کہ وہاں اس کی موجودگی کا علم اُن دونوں کو نہ

ہونے پائے۔ مگر وہ ہراسہ و زاری میں آکودا۔ اگر حمید اس پر فائر نہ کرتا تو قاسم کہاں ہوتا۔

”قاسم شور نہ مچاؤ۔“ حمید نے آہستہ سے کہا۔ ”تم اس وقت خطرے میں تھے۔ گولی میں

نے چلائی تھی۔“

”ارے واہ.....!“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔ ”میں ہی خطرے میں تھا اور مجھ ہی پر تم نے

گولی چلائی..... تمہاری عقل میں کھوپڑی ہے یا نہیں۔“

دفعۂ نفلی منزل کا دروازہ کھلا اور بیرونی برآمدے کا کچھ حصہ روشن ہو گیا۔

سعید بابر شب خوابی کے لباس میں دروازے میں کھڑا تھا۔ قاسم بڑی تیزی سے اس کی

طرف جھپٹا۔ مگر حمید نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”اس سالے کو بار بار بتاؤں گا۔ مگر تم نے مجھ پر فائر کیوں کیا تھا۔“ وہ رک کر حمید کی

طرف پلٹ پڑا۔

حفاظت سرکاری طور پر کر رہا ہوں۔ اس وقت تمہارا دوست نہیں..... جاؤ۔“

سعید بابر فرش پر بیٹھا بایاں گال دبائے خون تھوک رہا تھا۔

”اچھا سرکاری کے بچے! میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“ قاسم یکھت دوسری طرف مڑتا ہوا بولا۔

پھر برآمدے کے نیچے اتر کر دھاڑا۔ ”سعید بابر..... کان کھول کر سن لو..... اب اگر تم نے راحلہ کا نام بھی لیا تو جہنم میں ہو گے۔ ہاں.....! اور پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا تار کی میں گم ہو گیا۔

”یہ یہاں اس وقت کیوں آیا تھا۔“ حمید نے سعید بابر سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا..... عجیب وحشی آدمی ہے۔“

”ویسے وہ کئی بار مجھ سے بھی کہہ چکا ہے کہ اُسے آپکا اور راحلہ کا ملنا جلنا پسند نہیں ہے۔“

”جھک مارتا ہے..... میں اور راحلہ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔“

”اوہ خیر..... مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن یہ نئی اطلاع اُس

کے لئے سنسنی خیز ضرور تھی۔ سنسنی خیز اس لئے تھی کہ قاسم اس کے متعلق سنتے ہی شائد اپنی ہی ہڈیاں چبا ڈالے۔“

”آج یہاں دراصل میری ڈیوٹی تھی۔“ حمید نے سعید بابر سے کہا۔ ”جس دن سے آپ

پر حملہ ہوا ہے کوئی نہ کوئی یہاں ضرور موجود رہتا ہے۔“

”میں شکر گزار ہوں جناب۔“

”ذرا نارنج مجھے دیجئے اور میرے ساتھ آئیے۔“ وہ دونوں برآمدے میں آئے۔

حمید نے نارنج کی روشنی وہاں ڈالی جہاں اُسے وہ پُر اسرار سایہ نظر آیا تھا۔ یہاں ویسے ہی حیرت انگیز نشانات موجود تھے۔

”میرے خدا.....!“ سعید بابر خوفزدہ آواز میں بڑبڑایا۔

”میں نے اسی پر فائز کیا تھا..... مگر شائد وہ فولاد یا پتھر کی کوئی مخلوق ہے۔“

”چلئے۔“ سعید بابر اُسکا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ ”یہاں اب نہ ٹھہریئے۔“

سعید دوڑ رہا تھا۔ حمید کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ لہذا حمید کو بھی دوڑنا پڑا تھا۔ سعید بابر

دروازہ بند کر کے ہانپنے لگا۔

”کون صاحبان.....!“ سعید بابر نے برآمدے سے کہا۔ ”میں نے شاید فائروں کی

آوازیں سنی تھیں۔ میرے ہاتھ میں بھی ریوالتور ہے اور میں ایک ستون کی اوٹ میں ہوں۔“

”کیپٹن حمید.....!“ حمید نے گرجدار آواز میں کہا۔

”اوہو..... کپتان صاحب..... فرمائیے۔“ سعید بابر پھر روشنی میں آ گیا۔

”میں فرماؤں گا.....!“ قاسم دھاڑا۔ ”اور ایسا فرماؤں گا کہ تم مہینوں چار پائی سے اٹھ نہ سکو گے۔“

”یہ کون صاحب بول رہے ہیں کپتان صاحب! آپ حضرات یہاں کیوں تشریف لائے۔“

”جہاں تم کہو۔“ قاسم نے چیلنج کرنے سے انداز میں کہا۔ ”میں ہر جگہ تیار ہوں گا۔“

”قاسم خاموش رہو.....!“ حمید نے کہا۔

وہ دونوں برآمدے میں پہنچ گئے۔

”اوہو..... قاسم صاحب.....!“ سعید بابر نے حیرت سے کہا پھر حمید کی طرف دیکھ کر

بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس وقت آپ حضرات کی موجودگی کا کیا مطلب ہے۔“

”موجودگی کا مطلب موجودگی ہے۔“ قاسم غریبا۔ ”ہاں اب کہو، جو کچھ کہہ رہے تھے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا جناب۔“

”جناب سالانہ گیا چو لے میں..... میں شرافت سے نہیں پیش آؤں گا۔“

حمید نے سوچا کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو فریدی اچھی طرح اُسکی خبر لے

گا۔ لہذا اس نے سعید بابر سے کہا۔ ”کیا آپ کو علم ہے کہ آج رات بھی آپ بال بال بچے ہیں۔“

”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ بال بال بچے ہیں۔“ قاسم غریبا۔ ”کیا تم میرا ہاتھ پکڑ لو گے،

ہے اتنی ہمت..... ہاں بابر صاحب۔ اب تم راحلہ کا نام ناپاک زبان سے نکالو تو دیکھو۔“

”راحلہ کیا مطلب.....!“

قاسم کا ہاتھ چل گیا۔ بھرپور ہاتھ۔ سعید بابر لڑکھڑاتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

”قاسم..... تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“ حمید درمیان میں آ گیا۔ ”پیچھے ہٹو ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”ارے..... ارے.....!“ قاسم پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

”بس چلے ہی جاؤ۔ اسی میں خیریت ہے۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔ سعید بابر کی

خونفک لمحات

حمید کو نہیں معلوم تھا کہ اب فریدی کا کیا پروگرام ہے۔ اُس نے اُسے وہ سارے واقعات بتائے تھے جو سعید بابر کی کوشی میں پیش آئے تھے، جواب میں فریدی نے مسکرا کر صرف اتنا ہی کہا۔ ”ضروری نہیں کہ ہماری ساری اسکیمیں کامیاب رہی ہوں۔ میں نے دوسری طرح کام نکالنا چاہتا تھا مگر نہیں ہو سکا۔“

حمید نے سوچا کہ نہیں ہو سکا تو جہنم میں جائے۔ اُسے کیا؟ مگر اُس نے فریدی کو راحلہ اور سعید بابر کی ہونے والی شادی کی خوشخبری سنائی دی۔

”بہت دلچسپ.....!“ فریدی مسکرایا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک تھی۔

”ضرور دلچسپ.....!“ حمید دانت نکال کر بولا۔ ”دوسروں کی شادیوں کے متعلق سن کر

آپ کو کافی مزہ آتا ہے۔“

فریدی باہر جانے کے لئے تیار تھا اس لئے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ حمید اپنے کمرے میں آ گیا، وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں بمشکل تمام تین گھنٹے سویا ہوگا۔

بستر پر جانے سے پہلے اُس نے قاسم کو فون کیا۔ فون سلیم نے ریسیور کیا تھا۔ پھر قاسم آ گیا۔

”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ قاسم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”مت کرو بات..... لیکن میں سرکاری طور پر وہاں سعید بابر کی حفاظت کے لئے تھا۔“

”سرکاری کی ایسی کی تھی۔ تم نے پہلے مجھ پر گولی چلائی پھر دوبارہ گولی مار دینے کی دھمکی

دی۔ ویسے اگر تم مجھ سے پتہ چاہو تو میں اب بھی تیار ہوں۔“

”میں نے تم پر گولی نہیں چلائی تھی۔ تمہارے پیچھے ایک آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سعید کی

تاک میں آیا ہو۔ بہر حال میری ایک بھی گولی اس کے نہیں لگی۔ سعید بابر کی زندگی خطرے میں

ہے۔ ایک بار تمہاری موجودگی میں بھی اس پر فائر ہو چکا ہے۔“

”صرف زندگی خطرے میں ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ سالامرے بھی تو کسی طرح۔“

”اب میں ایک بڑی خبر سناؤں گا۔“ حمید نے کہا۔ ”راحلہ اور سعید کی شادی ہونیوالی ہے۔“

”قی.....!“ قاسم دھاڑا۔ ”قہمی نہیں ہونے دوں گا۔“

”بھلا تم کیسے روک سکو گے۔ راحلہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔“

”میں دونوں کو گولی مار دوں گا۔“

”آخر کیوں! تمہارا کیا بگڑتا ہے۔“

”میں اب دنیا میں کسی کی شادی نہیں ہونے دوں گا..... ساجھے۔“

”کیوں بر خور دار.....!“

”یونہی..... میرا دل چاہتا ہے اور اب تو میں سعید بابر کو شہر ہی میں نہ رہنے دوں گا۔“

قاسم نے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا۔ حمید نے جیسے ہی ریسیور رکھا۔ گھنٹی پھر بجی۔

”ہیلو..... حمید۔“ آواز آئی۔ آواز فریدی کی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ ”عدنان والا کیس بھی

میرے ہی پاس ہے۔ تم تصویر سے مل کر اُن چاروں آدمیوں کے متعلق ضرور معلومات فراہم کرو،

جو عدنان کے ساتھ ہی غائب ہو گئے تھے۔ اس کے لئے اپنی تمام تر ہمدردیاں ظاہر کرنا محض اس

لئے کہ ہم میں شناسائی تھی سمجھے۔“

”سمجھ گیا..... جارہا ہوں۔ لیکن نیند کی وجہ سے دماغ کچھ ماؤف سا ہو رہا ہے۔ اگر ایسی

ذہنی حالت میں مجھے تصویر سے عشق ہو گیا تو تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ کیونکہ نیند ہی کے

عالم میں ایک بار.....!“ حمید بکٹا رہا اور فریدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اُسے بہت عرصہ سے تصویر کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ اُس نے اس کی حیرت انگیز صحت کے

متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔

تصویر نے اُسے اپنے نئی آفس میں ریسیو کیا۔ لیکن حمید اس کے چہرے سے قطعی اندازہ نہ

لگا سکا کہ وہ اپنے لڑکے کے لئے مغموم ہے۔

آفس میں دو لڑکیاں رجسٹروں پر جھکی ہوئی تھیں۔

”مجھے یہاں کی پولیس سے بڑی شکایت ہے۔“ تصویر نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن آپ لوگ بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ کئی بار کے

سزا یافتہ لوگوں کو آپ نے باڈی گارڈ بنا رکھا تھا۔“

”ذرا مجھے بھی تو آگاہ کیجئے اس مقام سے۔“ لڑکی اپنا اوپر ہونٹ بھیج کر بولی۔
 ”نگین مرغزاروں میں چاندی کی جھیلوں کے کنارے، صنوبر کے سائے تلے اور.....!“
 ”یعنی ہم.....!“ لڑکی بات کاٹ کر بولی۔ ”مرغزاروں کی گھاس چریں اور جھیل سے
 ٹھنڈا پانی پی کر سو رہیں۔“

”اوہ..... آپ میں جمالیاتی حس بالکل نہیں معلوم ہوتی۔“
 ”جی ہاں..... اس وقت بالکل مردہ ہو گئی ہے جمالیاتی حس..... کیونکہ صبح سے اب تک
 صرف دو سلاخیں اور ایک کپ چائے پر ہوں۔ لٹچ کے بعد پھر جاگ اٹھے گی جمالیاتی حس۔“
 ”اوہو! مجھ سے غلطی ہوئی۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”لڑکیوں کا صحیح مقام دراصل باورچی
 خانہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری نانی صاحبہ اپنے وقت کی سب سے بڑی مفکر تھیں۔“
 ”خدا عافرت کرے ان نانیوں اور دادیوں کو انہیں کی بدولت عورتوں کی مٹی پلید ہوئی ہے۔“
 حمید جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تنویر واپس آ گئی۔ لیکن اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا
 آنکھوں سے بے چینی مترشح تھی۔

”ذرا میرے ساتھ آئیے۔“ اس نے کہا اور پھر دروازے کی طرف مڑ گئی۔ حمید اٹھ کر
 باہر نکل آیا۔

”کیا بات ہے..... آپ کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہیں۔“
 ”ہاں..... میں پریشان ہوں۔ میں دراصل آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتی تھی لیکن اب وہ
 وہاں نہیں ہے..... آئیے میرے ساتھ۔“

حمید اپنے شانوں کو جنبش دے کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ رہائشی عمارت میں آئے۔ یہ
 شاید نشست ہی کا کمرہ تھا۔ تنویر نے منغل پیس پر رکھے ایک آنسو ڈبے کی طرف اشارہ کیا
 جس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

”آج کل میری کوٹھی میں کچھ نامعلوم آدمی..... ٹھہریے۔“ وہ دروازے کی طرف جھپٹی
 اور حمید اس ڈبے کی طرف دیکھنے لگا۔ تنویر کا جملہ اور اشارہ دونوں ہی ادھورے سے رہ گئے
 تھے۔ وہ دروازے تک گئی اور پھر واپس آ گئی۔

”یہ تو مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ وہ سزا یافتہ تھے۔“ تنویر بولی۔ ”اُن مردودوں نے مجھے
 اپنے سرٹفیکٹ دکھائے تھے۔“

”چور یوں، ڈکیتیوں اور کشت و خون کے سرٹفیکٹ.....!“ حمید نے پوچھا۔
 ”نہیں..... انہوں نے کہا کہ وہ ریٹائرڈ فوجی ہیں۔ ان کے پاس سرٹفیکٹ تھے۔“
 ”اوہ..... تو آپ ان کے متعلق دھوکے میں تھیں۔“
 ”قطعاً دھوکے میں رہی۔“

”وہ آپ کے پاس کب سے تھے۔“
 ”پانچ سال سے..... لیکن اس دوران میں کبھی انہوں نے مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔
 میں نہیں سمجھ سکتی کہ وہ عدنان کو کیوں لے گئے۔“
 ”اگر عدنان صاحب ہی انہیں کہیں لے گئے ہوں تو۔“

”نہیں..... وہ مجھے اطلاع دیے بغیر کہیں نہیں جاسکتا۔“ تنویر نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔
 پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کچھ اور بھی کہے گی لیکن وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولی اور حمید دونوں لڑکیوں کا
 جائزہ لیتا رہا۔

”ٹھہریے..... میں ابھی آتی ہوں۔“ تنویر نے کہا اور اٹھ کر آفس سے نکل گئی۔
 حمید اب باقاعدہ طور پر لڑکیوں کو گھورنے لگا تھا۔ ایک لڑکی سے کئی بار نظریں ملیں۔ حمید
 کے دیکھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ لڑکی کو بولنا ہی پڑا۔

”کیا آپ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“
 ”جی ہاں.....!“ حمید ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لڑکیوں کو
 کلر کی کرتے دیکھ کر میرا کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔“

لڑکی برا سامنے بنا کر پھر کاغذات میں مشغول ہو گئی۔ حمید نے دوسری لڑکی کی طرف دیکھا
 جو اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کا کلیجہ خون کیوں ہو جاتا ہے جناب۔“
 ”آپ اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھ سکتیں۔ میں لڑکیوں کو انکے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ہوش میں آئے ہوئے کافی وقت گزر گیا لیکن حمید کی ذہنی اور جسمانی حالت درست نہ ہوئی۔ اس کا ذہن اوٹ پٹانگ خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ کیفیت وہی تھی جو کسی بے ربط خواب کی ہوتی ہے۔

پھر اُس نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی اور دفعتاً چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ زینوں پر اُسے تو یہ نظر آئی۔ بڑی شان سے آہستہ آہستہ نیچے آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنر تھا۔ وہ حمید سے تین یا چار فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ اس کی آنکھوں سے حقارت اور نفرت جھانک رہی تھی۔

”عدنان کہاں ہے۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”میں..... کیا جا..... نوں.....“ حمید نے بدقت کہا۔

”یہ اذیت خانہ ہے..... تم سک سک کر مر جاؤ گے۔“

حمید نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے میں تو یہ نے اس کے سینے پر پیر رکھ دیا اور حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے سینے کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ پتہ نہیں وہ حقیقتاً اتنی ہی طاقتور تھی یا یہ حمید کی موجودہ نقاہت تھی جس کی بناء پر اس نے ایسا محسوس کیا تھا۔

”خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ پڑے رہو۔ اُس نے اس کے سینے پر سے پیر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ورنہ یہاں تمہیں کوئی رونے والا بھی نہیں ملے گا۔“

حمید پھر حمید تھا اور تو یہ عورت تھی۔ معمر اور سخت مزاج ہی سہی لیکن اپنی صحت اور رکھ رکھاؤ کی بناء پر غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

”تو یہ.....!“ حمید نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”ہوش میں آنے کے بعد میں کچھ اور سمجھا

تھا مگر تم عدنان کا قصہ لے بیٹھیں۔“

”کیا سمجھتے تھے۔“ تو یہ غرائی۔

”میں سمجھا تھا شاید تم مجھ پر عاشق ہو گئی ہو۔“

”شراب.....!“ چمڑے کا ہنر حمید کے پیروں پر پڑا۔ مگر وہ تمللانے کی حد تک بھی ہاتھ

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ یہ کیا قصہ ہے۔ ہر وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی چھپ کر میری گفتگو سن رہا ہو..... عدنان کا اس طرح غائب ہو جانا کسی گہری سازش کا پیش خیمہ ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھتی تھی کہ شاید وہ چاروں مجھ سے کوئی بڑی رقم وصول کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہمارا بھی یہی خیال تھا۔“ حمید نے کہا۔

”مگر اب..... کچھ ہی رات کی بات ہے کمپاؤنڈ میں کچھ نامعلوم آدمی موجود تھے انہوں نے کئی کھڑکیوں سے شیشے توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش بھی کی تھی۔“

”کامیاب نہیں ہو سکے۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں کامیاب ہو سکے..... لیکن آج صبح میں نے ایک کھڑکی کے نیچے ایک لاکٹ پڑا پایا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ پولیس کے کسی کام آسکے لہذا میں نے اُسے اس سیاہ ڈبے میں رکھ دیا۔ آپ کی آمد پر میں نے ارادہ کیا کہ وہ لاکٹ آپ کو دکھاؤں..... مگر میرے خدا اس ڈبے میں لاکٹ کی بجائے.....!“

تو یہ پھر خاموش ہو گئی۔ اُسکے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بُری خبر سنا رہی ہو۔ آخر اس نے بدقت تمام کہا۔ ”اس ڈبے میں ایک کٹا ہوا ہاتھ ہے۔“

حمید ڈبے کی طرف جھپٹا اور اُسے مینٹل پیس سے اتار کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

”کیا یہ مقفل ہے۔“ اُس نے پوچھا۔

”نہیں وہ سفید بٹن دبائیے۔“ تو یہ بولی۔

بٹن پر انگلی پڑتے ہی دھکن اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا..... لیکن حمید..... لڑکھڑا کر دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ڈبہ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ مگر نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ آنکھوں اور ڈبے کے درمیان زرد رنگ کا گہرا غبار حائل ہو گیا تھا۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اندھیرے میں ہو۔ گہرے اندھیرے میں۔ پھر اُسے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ اُسے وقت کا احساس نہیں ہوا۔ البتہ اب بھی وہ اندھیرے ہی میں تھا اور اس کی ذہنی حالت اعتدال پر نہیں آئی تھی۔ اُس نے زمین سے اپنا وہ ہاتھ اٹھا چاہا جس پر ریڈیم ڈائسل کی گھڑی تھی لیکن یہ بھی ممکن نہ ہوا۔ ویسے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ پیر آزاد ہیں۔

پیر نہیں ہلا سکتا تھا۔ ڈبے سے نکلنے والا زرد رنگ کا غبار شاید اسی لئے استعمال کیا گیا تھا کہ اس کی قوت ہی ختم ہو جائے۔ مگر حمید کی زبان کی قوت سب کرنا کس کے بس کا روگ تھا۔
”میں اس ٹریچڈی کے بعد ایک کہانی لکھوں گا جس کا عنوان ہوگا ’سنگدل محبوبہ‘۔“
ہنر پھر پڑا۔

”مار ڈالو.....!“ حمید مسکرا کر بولا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ حمید کو چوٹ کا بھی کچھ ایسا زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔

تویر چند لمحے اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔
”تمہیں بتانا پڑے گا کہ عدنان کہاں ہے۔“
”ہم اُسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ طریقہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ تویر کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ عدنان کو ہم نے اغواء کیا ہے۔“
تویر کچھ نہ بولی۔ وہ غور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

”خدا کی قسم بس ذرا سا مسکرا دو۔ ان پتلی پتلی یا قوتی کا شوق پر مسکراہٹ بڑی بھلی لگتی ہوگی۔“
”شٹ آپ.....!“
حمید ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اُس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ عدنان کہاں ہے۔

”کیا تم ایک رات زغالی کے گھر نہیں گئے تھے۔“ تویر نے پوچھا۔

”یقیناً گیا تھا.....!“

”تمہارے ساتھ کون کون تھا۔“

”سار جٹ رمیش اور پروفیسر دیال۔“

”کیوں گئے تھے۔“

”کسی عجیب و غریب جانور کے پیروں کے نشانات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے۔“

”نشانات کہاں ملے تھے۔“

”افریقہ کے ایک تاجر سعید بابر کی کمپاؤنڈ میں۔“

”تمہیں زغالی کے پاس کس نے بھیجا تھا۔“

”کرنل فریدی نے۔“

”اُسے کیا معلوم کہ زغالی اُس کے متعلق کچھ بتا سکے گا۔“

”کرنل فریدی آدمی نہیں جن ہیں۔“ حمید نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

تویر تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموش ہو گئی اور حمید بولا۔ ”تم آخر یہ سب مجھ سے کیوں

پوچھ رہی ہو۔ کیا تم اُس جانور کے متعلق کچھ جانتی ہو۔“

”ہاں..... میں جانتی ہوں۔“ تویر کے ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”میں جانتی ہوں۔ وہ آدمی کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتا ہے۔ کل رات وہ کرنل فریدی اور

کیپٹن حمید کا گوشت کھانے کیلئے گیا تھا مگر وہ دونوں ہوشیار تھے۔ پھر وہ سعید بابر کا گوشت کھانے

کیلئے گیا لیکن وہاں بھی کیپٹن حمید ہی آڑے آیا۔ لہذا اب تم خود سوچ لو کافی سمجھدار ہو۔“

حمید سانے میں آ گیا۔ اب اس کی عقل راستے پر آ رہی تھی۔ نہ صرف عقل صحیح راستے پر

آ رہی تھی بلکہ فریدی کی بعض ”حماقتیں“ بھی یاد آ رہی تھیں۔ مثلاً بچپلی رات کو اس نے اس گول

مٹول بلا کے تعاقب میں جانے کی بجائے تویر کے ٹیلی فون نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیئے تھے۔

تو کیا..... تویر ہی..... حمید کانپ گیا۔ اُس نے تویر کی طرف دیکھا جو پلکیں جھپکائے بغیر

اُس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو۔“ تویر کی تیز قسم کی سرگوشی کمرے میں گونجی۔

”کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو۔“

حمید کچھ نہ بولا۔

”میں تمہیں دکھاؤں گی۔“ تویر دائیں طرف والی دیوار کی طرف جاتی ہوئی بولی۔ اچانک

کمرے کی تیز روشنی دھندلاہٹ میں تبدیل ہو گئی..... اور حمید نے محسوس کیا جیسے سانے والی

دیوار اپنی جگہ سے کھسک کر ایک طرف دوڑتی چلی گئی ہو۔ ساتھ ہی سڑتے ہوئے گوشت کی بدبو

سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔

ہنسی ہوئی دیوار کی دوسری طرف گہری تاریکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ تاریکی بھی

دھندلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔

فرش پر ایک بہت بڑی سی گیند لڑھکتی پھر رہی تھی۔ حمید کچھ اس قسم کی آوازیں بھی سن رہا تھا جیسے کوئی ریلوے انجن اسٹیم چھوڑ رہا ہو۔

”ٹمڈونگا.....! میں وہاں روشنی کروں گی۔“ تنویر نے کہا۔

اور وہ گول منول سایہ لڑھکتا ہوا ایک طرف چلا گیا اور دوسرا کمرہ بھی روشنی میں نہا گیا۔ مگر حمید نے دوسرے ہی لمحے میں اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ سامنے ہی اسے انسانی ہڈیوں کے تین پنجر نظر آ گئے تھے۔ دو تو صرف ہڈیوں کے ڈھانچے تھے لیکن تیسرے پر ابھی تھوڑا گوشت باقی تھا اور شاید یہ اسی کی بدبو تھی۔ اچانک ایک آدمی گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جہاں حمید فرش پر چٹ پڑا ہوا تھا۔ آنے والے کا شیوہ بڑھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر مردنی تھی۔ آنکھیں حلقوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ حمید نے اسے پہچان لیا۔ وہ انہیں چاروں میں ایک تھا جن کی تصویریں اس نے کو توالی میں دیکھی تھیں وہ آتے ہی تنویر کے قدموں پر ڈھیر ہو گیا۔

”معاف کر دیجئے محترمہ..... خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔“ وہ روتا ہوا گر گڑا یا مگر تنویر نے بڑا سامنے بنا کر اسے ٹھوکر ماردی۔

حمید کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑا رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ گول سایہ روشنی کا نام سن کر وہاں سے ہٹ کیوں گیا تھا۔

”نہیں تجھے معاف نہیں کیا جاسکتا۔“ تنویر روتے ہوئے باڈی گارڈ سے کہہ رہی تھی۔

”تو ٹمڈونگا کی غذا بنے گا۔ اس کے لئے یہاں ایک شکار اور بھی ہے کیپٹن حمید۔ وہ نہیں

بتاتا کہ عدنان کہاں ہے۔ اگر تو بتا دے تو میں اسے معاف کر سکتی ہوں۔“

حمید نے دل میں کہا۔ ”تم مجھے ضرور معاف کر دو گی میری الہڑ بڑھیا۔“

اب بہت کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے خیف آواز میں کہا۔ ”میں بتا دوں گا۔“

”بتاؤ..... میں تمہیں معاف کر دوں گی۔“

”پانی.....!“

”بتانے کے بعد پانی بھی مل جائے گا۔“

”میں مر رہا ہوں.....!“ حمید نے اس طرح اپنی آنکھوں کو گردش دی جیسے سچ مچ اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔

”پانی.....!“ اس کے حلق سے ایک ڈراؤنی سی آواز نکلی۔

”میں پانی لا رہی ہوں۔“ تنویر نے کہا اور زینوں کی طرف جھپٹی۔ حمید نے اس وقت تک یہ ایکٹنگ جاری رکھی جب تک کہ اس کے قدموں کی آہٹ سکوت میں نہیں ڈوب گئی۔

دوسرا بد نصیب آدمی اسے بڑی بے تعلقی سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے ہر قسم کے جذبات فنا ہو گئے ہوں حتیٰ کہ اس کے چہرے پر خوف کے آثار بھی نہیں تھے۔ حمید نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا اور وہ گھٹنوں کے بل جھپٹا جیسے کوئی کتا اپنے مالک کی سیٹی پر دم ہلاتا ہوا دوڑا چلا آئے۔

”یہ روشنی میں کیوں نہیں آتا۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”روشنی میں اسے دکھائی نہیں دیتا۔“

”وہ ہے کیا بلا۔“

”خصیث..... نہ وہ آدمی ہے اور نہ جانور۔“

”کیوں نہ ہم اسے مار ڈالیں۔“

”ناممکن..... وہ ہزاروں پر بھاری ہے..... لیکن کیا آپ کے پاس ریوالور ہے۔“

”نہیں.....!“

”قطعاً ناممکن.....!“

”پھر کیا تم مرنا ہی چاہتے ہو۔“ حمید نے کہا۔

”مقدر.....!“ اس نے بے بسی سے کہا لیکن پھر جلدی سے بولا۔ ”تنویر کے بلاؤز کے

گریبان میں ہر وقت ایک پستول رہتا ہے۔“

”اوہ..... بس اب تم ہٹ جاؤ۔“ حمید نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ باڈی گارڈ پھر

گھٹنوں کے بل چلتا ہوا وہیں پہنچ گیا۔ جہاں تنویر اسے چھوڑ کر گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پھر زینوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ تویر پانی کا گلاس لئے ہوئے نیچے آ رہی تھی۔ اُس نے قریب آ کر حمید کو آوازیں دیں۔ لیکن حمید چپ چاپ پڑا رہا۔ تویر شاید یہ سمجھی کہ اس پر دوبارہ غشی طاری ہو گئی ہے۔

وہ اس کے قریب ہی بیٹھ کر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی اور پھر حمید بیک بیک اس پر ٹوٹ پڑا۔ سب سے پہلے اس کا ہاتھ اس کے گریبان کی طرف بڑھا لیکن کامیابی نہ ہوئی اور حمید اُس کی طاقت کا اندازہ کر کے ششدر رہ گیا۔ وہ کبھی کسی عورت میں اتنے پھر تیلے پن اور طاقت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تویر اس کی گرفت سے نکل گئی اور باڈی گارڈ چیخا۔

”کپتان صاحب یہ سوچ بورڈ کی طرف نہ جانے پائے۔“

حمید نے پھر اس پر چھلانگ لگائی مگر اس کا سر دیوار سے ٹکرایا لیکن وہ پھر سنبھل کر تویر کی طرف جھپٹا۔ مگر اب وہ سوچ بورڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ دفعتاً روشنی دھندلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ باڈی گارڈ کے حلق سے ایک خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔ دوسری طرف تویر چیخ کر بولی۔

”مڈونگا میں خطرے میں ہوں۔“

حمید کو بس اتنا ہی یاد ہے وہ گیند سی بلا اتنی تیزی سے وہاں پہنچی تھی جیسے کسی نے اس پر ہٹ لگائی ہو۔ تویر نے ایک زہریلا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ”مڈونگا“ لیکن وہ آگے نہ کہہ سکی کیوں کہ زینوں کی طرف سے پے در پے تین چار فائر ہوئے۔ کمرے میں سیٹیاں اور سسکاریاں گونجنے لگیں۔

”توی..... توی.....“ سیٹیوں اور سسکاریوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ ”میں تو چلا..... تیرا وقت بھی قریب ہے۔“

تویر دیوانہ وار زینوں کی طرف فائر کرنے لگی اور پھر شاید اس کا پستول خالی ہی ہو گیا۔ سیٹیاں اور سسکاریاں اب بھی کمرے میں گونج رہی تھیں اور وہ بڑی سی گیند اپنی ہی جگہ پر بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ زینوں کی طرف ایک فائر پھر ہوا اور وہ آوازیں بھی ختم ہو گئیں۔

حمید نے اندھیرے میں فریدی کا قہقہہ سنا وہ کہہ رہا تھا۔ ”تویر اب وہ چیز ختم ہو گئی جس

کی وجہ سے تم سا لہا سال سے اپنے گھر والوں اور قریبی حلقوں میں پراسرار مشہور رہی ہو اور یہ خالی پستول اب اپنے سر پر مارلو۔ کم از کم ایک کارتوس خودکشی کے لئے تو چھوڑا ہوتا۔“

سائے کی لاش

فریدی سوچ بورڈ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے کمرے میں روشنی کر دی۔ دفعتاً تویر کے حلق سے ایک کھٹی کھٹی سی چیخ نکلی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ فریدی کے ساتھ عدنان بھی تھا۔

وہ عجیب الحلقہ آدی یا جانور فرش پر چپٹ پڑا ہوا تھا۔ انتہائی ڈراؤنا۔ اس کی لاش بھی خوفزدہ کر دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کا قد بمشکل تمام چار فٹ رہا ہوگا۔ پھیلاؤ بھی اُس سے کسی طرح کم نہ رہا ہوگا۔ چہرہ جھریا ہوا اور خوفناک تھا۔ بڑے بڑے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ پلکیں تک سفید ہو گئی تھیں اور اس کے پیر..... وہ یقیناً عجیب تھے۔ خود اس کی ہیئت سے بھی زیادہ عجیب۔

”مڈونگا.....!“ اچانک تویر چیخ مار کر اس کی لاش پر گر پڑی۔

”میرے پیارے.....!“ وہ اپنے بال نوج رہی تھی۔ ”تو دس ہاتھوں سے زیادہ طاقتور تھا..... مگر میرے پیر چاٹتا تھا۔ مڈونگا..... میں تجھ پر ظلم کرتی تھی۔ تجھے کوڑے لگاتی تھی تو میرا پرستار تھا۔ میں زندگی بھر تیرے لئے روتی رہوں گی۔ تیرے قاتل کو کبھی معاف نہ کروں گی۔“

”ممی..... کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔“ عدنان جھپٹے ہوئے انداز میں چیخا۔ تویر کچھ نہ بولی۔

وہ آگے کی طرف جھکی اور مردہ آدم خور کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔

”میں اسے گولی مار دوں گا۔“ عدنان فریدی سے ریوا لور چھیننے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

فریدی نے اُسے آہستہ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت یہ تمہاری ماں نہیں ہے۔ صرف ایک عورت ہے۔“

عدنان سر جھکائے ہوئے زینوں کی طرف مڑ گیا۔ فریدی نے اُسے روکا نہیں۔ وہ اوپر جانے کے لئے زینے طے کر رہا تھا۔ حمید اور فریدی خاموش کھڑے رہے۔ باڈی گارڈ ایک

کونے میں منہ ڈالے کھڑائی طرح کانپ رہا تھا۔

”بدلو سے میرا دماغ پھٹ رہا ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”یہ کجنت آدم خور بھی تھا۔ تین باڈی گارڈوں کو صاف کر گیا۔ ان کی لاشیں سڑ رہی ہیں اور چوتھا وہ ادھر ہے۔“

فریدی حمید کی بات کی طرف دھیان دیئے بغیر تنویر کی طرف بڑھا جواب بھی مڈونگا کی لاش پر پڑی کسی چھوٹی سی پکی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

فریدی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”جاؤ یہاں سے..... میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ اگر میں مجرم ہوں تو مجھے اسی تہہ خانے میں بند کر دو۔ میں ایڑیاں رگڑ کر مر جاؤں گی۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اسی لئے میں نے تمہارے لئے خودکشی جوہر کی تھی کیونکہ تمہارے عدالت میں پیش ہونے سے عدنان کا سوشل اسٹیشن خطرہ میں پڑ جائے گا۔ ہاں سعید باہر اور داراب کی گرفتاری میں مجھے مدد ملے گی۔“

”سعید باہر..... داراب.....!“ تنویر نے حیرت سے کہا اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ چند لمحوں فریدی کو گھورتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”انہیں کیوں گرفتار کرو گے۔ ان کی تو پشت پناہی کر رہے تھے تم.....!“

”ہاں..... میں کبھی کبھی مجرموں کو اس وقت پکڑتا ہوں جب وہ میرے گلے میں بانہیں ڈالے مجھے اپنی محبت کا یقین دلا رہے ہوں۔“

”اُس کے بھائی کا قصہ.....!“ تنویر نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

”اُس کا بھائی.....!“ فریدی ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”اُس کا بھائی ابھی تک میری محافظت میں تھا اور شاید سوتیلی ماں اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔“

”تم کیا..... جانو..... تم کیا جانو.....!“ اس نے مضطربانہ انداز میں فریدی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

فریدی اسی طرح کھڑا رہا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

”میرے ذرا تلخ لہجہ محدود ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”مگر عدنان اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”نہ جانتا ہوگا..... میں نے ابھی تک اُس سے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔“

”میں ضرور مدد دوں گی۔ تم جو کچھ بھی کہو، میں ان کتوں کی لاشیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے خواہ مخواہ میری پرسکون زندگی میں زہریلے کانٹے بوئے۔ میں سب کچھ بھول گئی تھی۔“

”تمہیں براہ راست پولیس سے مدد طلب کرنی چاہئے تھی۔“

”میں اپنی پرانی تاریک زندگی پر سے پردہ نہیں ہٹانا چاہتی تھی۔ تمہیں پورے حالات کا علم نہیں ہے شاید۔“

فریدی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ..... وقت کم ہے۔“ پھر اُس نے باڈی گارڈ سے کہا۔ ”شکر تم یہیں ٹھہرو گے۔“

”اچھا..... حضور..... والا.....!“

وہ تینوں اوپر آئے اور حمید نے محسوس کیا کہ وہ ابھی تک ایک تہہ خانے میں رہے ہیں۔

تنویر بڑبڑا رہی تھی۔ ”عدنان کو تہہ خانوں کا بھی علم نہیں تھا۔“

فریدی نے کہا۔ ”مجھے ان پراسرار کمروں کا علم عدنان سے ہوا تھا۔ تہہ خانے میں نے دریافت کئے تھے۔ میری اسکیم دوسری تھی۔ یہاں اس طرح آنے کا ارادہ نہیں تھا جس طرح پہنچا ہوں۔ مگر میرے تجربوں نے خبر دی کہ کیپٹن حمید کو تمہاری کوشی سے برآمد ہوتے نہیں دیکھا گیا اور اس وقت شاید مجھے ایک منٹ کی بھی دیر ہوتی تو.....!“

”مجھے اس پر افسوس نہیں ہے۔“ تنویر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں عدنان کو بچانا چاہتی تھی

لیکن مڈونگا کی موت کے بعد مجھے اس کے بچ جانے کی بھی خوشی نہیں ہے۔ میں شروع ہی سے سمجھتی تھی کہ عدنان تمہارے قبضے میں ہے۔“

”چار خون تمہاری گردن پر..... زغالی کو بھی تم نے ہی گولی ماری تھی اور برقعہ زینوں پر

پھینک گئی تھی۔“

”میری گردن پر سینکڑوں خون ہیں۔“ تنویر نے لاپرواہی سے کہا۔ ”زغالی کو اس لئے مار

دیا تھا کہ کہیں مڈونگا کی کہانی تم تک نہ پہنچ جائے۔ وہ اس سے واقف تھا۔“

”سنائی.....!“ یک بیک فریدی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں..... سنائی..... سمندری ڈاکو، جس کا صحیح حلیہ کہیں کے سرکاری ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔“

”ہاں..... میں سنائی ہوں۔“ تنویر غرائی۔ ”سنائی تنوی..... میں نے درجنوں سرکاری جہاز لوٹے ہیں۔ جب میں اپنے قزاقوں سمیت کسی جہاز پر جا پڑتی تھی تو وہاں آگ خون اور چیخوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ میں سنائی تنوی ہوں جس نے سفید فام جہاز رانوں کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ میری لاش کے لئے انگریزوں نے ایک لاکھ پونڈ کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ تم آج بھی میری لاش انگریزوں کے حوالے کر کے ان سے یہ انعام حاصل کر سکتے ہو۔ ویسے اب شاید ہی انگلینڈ والوں کو یقین آئے کہ میں ہی سنائی ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی مہم میں کام آگئی۔“

”تم یہاں بہت دنوں سے ہو۔“ فریدی نے کہا۔

”ہاں..... میں یہاں اس وقت آئی تھی جب عدنان صرف ایک سال کا تھا اور اسی ذلیل کی بدولت آئی تھی جس کے بیٹے نے یہاں بھی میری زندگی تلخ کر دی۔ افریقہ کے مشرقی ساحل پر قزاقوں کے کئی گروہ کام کرتے تھے۔ میرا گروہ سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ اکثر یہ گروہ آپس ہی میں ٹکراتے اور اچھا خاصا کشت و خون ہوتا۔ ایک گروہ کا سردار بابر تھا۔ اسی سعید بابر اور عدنان کا باپ۔ ہم دونوں کے گروہ ایک بار آپس میں ٹکرائے گئے۔ بابر کے گروہ کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہو کر میرے سامنے آیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے بابر سے باقاعدہ طور پر شادی کر لی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے کچھ دن وہ ساحل پر رہتا تھا اور کچھ دنوں کے لئے اندرون ملک میں چلا جایا کرتا۔ لیکن اس نے مجھے اپنا صحیح نام بابر بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ شہباز کے نام سے مشہور تھا۔ میں کچھ اس طرح اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے! حالانکہ مڈونگا نے مجھے شادی ہی کے موقع پر آگاہ کر دیا تھا کہ شادی کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ ایک بہت بڑا جادوگر اور ستارہ شناس تھا۔ سینکڑوں میل دور سے طوفان کی ہوسونگھ لیتا تھا۔ وہ ہاتھیوں کی طرح طاقت ور تھا۔ میرا غلام تھا۔ مجھ سے ڈرتا تھا۔

حمید اس کی گفتگو پر عرش عرش کر رہا تھا۔ ایسی عورت آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ ابھی ابھی اُسے ایک سنگین ترین جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا لیکن اب وہ اتنے سکون اور اتنی لاپرواہی سے باتیں کر رہی تھی جیسے کسی ڈرامے کی ریہرسل میں حصہ لے کر لوٹی ہو۔ اوپر سارے کمرے ویران پڑے تھے۔ کہیں بھی کوئی نوکر نہیں دکھائی دیا۔ شاید تنویر نے انہیں چھٹی دے دی تھی۔

”میں نے یہی سمجھ کر عدنان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی کہ وہ تم لوگوں کے قبضے میں ہے۔“ تنویر نے کہا۔

فریدی ایک کمرے میں رک گیا اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ”بیٹھ جاؤ..... ابھی ہمیں آدھے گھنٹے تک انتظار کرنا پڑے گا۔“

”عدنان کہاں ہے..... میں اب اُس کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔“

”میں خود نہیں چاہتا..... وہ تمہیں گولی مار دے گا۔“

تنویر کچھ نہ بولی۔ فریدی نے کہا۔ ”وہ میرے آدمیوں کے پاس محفوظ ہے۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”میں انہیں موقع پر گرفتار کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اُن کے خلاف میرے پاس فی الحال ایک

شہادت ہے وہ بھی مکمل نہیں ہے۔“

”موقع سے کیا مراد ہے۔“

”ان کا خیال ہے کہ عدنان کا انواء محض افواہ ہے۔ وہ یہیں اسی کوشی میں کہیں موجود ہے۔ لہذا آج وہ تم دونوں کو ختم کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تمہارے مڈونگا کے لئے بھی وہ کافی انتظامات کے ساتھ آئیں گے ان کے ساتھ ایک بہت بڑا جال ہوگا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ یہ کیا قصہ ہے۔ ویسے تمہیں عدالت میں حاضر کر دینے کے لئے وہ ایک باڈی گارڈ ہی کافی ہوگا جو بیچ گیا ہے اور تین لاشیں۔“

”تم بار بار اُس کا تذکرہ نہ کرو۔ میں کہہ چکی ہوں کہ میری گردن پر سینکڑوں کے خون ہیں۔ آج بھی افریقہ کے مشرقی ساحل کے لوگ سنائی کے نام سے کانپتے ہیں۔“

میرے پیر چاٹا تھا۔ میں نے اس کا کہنا نہ سنا۔ بہر حال شادی ہوگئی۔ پھر عدنان پیدا ہوا..... اور مجھے شہباز کے بارے میں کچھ شکوک نے گھیر لیا۔ اکثر وہ تین تین ماہ غائب رہتا۔ ایک بار میں نے چھپ کر اس کا تعاقب کیا اور پھر یہ حقیقت مجھ پر کھلی کہ وہ نیروبی کا ایک باعزت تاجر ہے۔ بہت بڑا تاجر اور اس کا نام شہباز نہیں بلکہ بابر تھا اور یہی نہیں..... یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ ایک لڑکے اور تین لڑکیوں کا باپ ہے۔ لڑکا اس وقت بارہ سال کا تھا۔ مجھ پر خون سوار ہو گیا۔ میں نے چاہا کہ بابر کو قتل کر دوں مگر اس بار مڈونگا نے مجھے بہت بڑی دھمکی دی۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے بابر کے خون میں ہاتھ رنگے تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس نے بتایا کہ بابر کا خون میرے لئے بتایا لائے گا۔ میں نے بابر کے سلسلے میں ایک بار اس کی بات نہیں مانی تھی اس کے لئے مجھے بچھٹانا پڑا تھا۔ لہذا اب مجھے اس کی بات کو اہمیت دینی پڑی۔ میں نیروبی سے دل شکستہ واپس آئی۔ دل مردہ ہو گیا تھا اس لئے قزاقی ترک کر دی چونکہ میرا صحیح حلیہ سرکاری فائلوں میں موجود نہیں تھا اس لئے میں کچھ دنوں کے بعد یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی لیکن داخلہ باضابطہ طور پر نہیں ہوا۔ میں مڈونگا کو بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ چونکہ وہ عجیب الخلق تھا اس لئے مجھے اس کو دوسروں کی نظروں سے چھپائے رکھنا پڑا تھا۔ مڈونگا نے کبھی کسی حال میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میرا دل زندگی کے آخری لمحات تک اس کیلئے روتا رہے گا۔

تویر ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

”مگر سعید بابر کو کیسے علم ہوا کہ تم اس کی سوتیلی ماں ہو۔ ظاہر ہے کہ بابر نے اپنے خاندان والوں سے یہ بات چھپائی ہوگی کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو وہ تمہیں اپنی اصلیت سے کیوں نہ آگاہ کرتا۔“

”آج سے دس سال پہلے بابر یہاں آیا تھا۔ اتفاقاً ایک جگہ مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ شکایات کا دفتر لے بیٹھا۔ میں نے اس سے کہا کہ خیریت اسی میں ہے کہ وہ مجھے بھول جائے اور سکون سے زندگی بسر کرنے دے ورنہ اس کا انجام بڑا دردناک ہوگا۔ میں اب بھی وہی سنائی ہوں جس کا نام مشرقی ساحل کی عورتیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔ بہر حال وہ مجھ سے متعلق ہو گیا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے بہت ڈرتا تھا اس نے اپنے

بیٹے سے میرا اور عدنان کا تذکرہ ضرور کیا ہوگا کہ ہم دونوں اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ بہر حال جب اس کہنے نے عدنان پر حملہ کیا تو میں سمجھ گئی کہ بابر کے خاندان کے کسی فرد نے اس سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ کتے کی شکل و شباهت عدنان نے مجھے بتائی تھی اور اسی بناء پر میں نے یہ سوچا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے کتے بابر کے علاوہ شاید ساری دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں تھے۔ بابر کو کتوں کا شوق تھا اور وہ ان کی نسلوں پر مختلف قسم کے تجربے کیا کرتا تھا۔ کئی نسلوں کے ملاپ سے اس نے یہ نئی نسل پیدا کی تھی۔ یہ بڑے خطرناک اور انتہائی درجہ زہریلے تھے۔ اکثر وہ انہیں بحری حملوں میں استعمال کیا کرتا تھا۔“

”مگر یہ کتا تو داراب کے پاس تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں تصدیق کر چکا ہوں۔ وہی اُسے ایسے کاموں کے لئے استعمال بھی کرتا تھا۔“

”ہو سکتا ہے..... داراب اور بابر بہت پرانے دوست تھے۔ میجر داراب اب بھی بہت دنوں تک افریقہ میں رہ چکا ہے اور شاید اب بھی وہاں اس کی تجارت ہے۔ بہر حال سعید بابر اس کے بل بوتے پر یہاں آیا ہے..... اور داراب..... وہ ویسے بھی مجھ سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ بہت عرصہ سے مجھ سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا میں نے اسے دھکار دیا۔ ایک موقع پر اسکی بے عزتی بھی کی اور پھر وہ خاموش ہو رہا۔ لیکن.....!“

”آہا..... ٹھہرو.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”تویر! تم اپنی پوری قوت سے عدنان کو آواز دو۔ اسی طرح آواز دیتی ہوئی اوپری منزل پر چلو..... کہیں کی روشنی نہ جلانا..... چلو اٹھو..... یہ آخری مرحلہ ہے اس کے بعد مجرم ہمارے ہاتھوں میں ہوں گے۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”بس دیکھتی رہو..... اٹھو..... دیر نہ کرو.....!“ فریدی نے حمید کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ تویر عدنان کو آوازیں دیتی ہوئی زینے طے کر رہی تھی۔ اچانک حمید نے عدنان کی بھی آواز سنی ”میں یہاں ہوں ماں.....!“

آواز کے ساتھ ہی ایک کمرہ روشن ہوا۔ پھر شاید اُسی کمرے کی کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ

کر چھپنا ہوا فرش پر آ رہا۔

”بہت عمدہ.....“ فریدی بڑبڑایا۔ ”سب کچھ اندازے کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ آؤ.....

تویر واپس چلیں..... کام ہو گیا۔“

”کیا ہو گیا.....!“

”جس کمرے سے عدنان کی آواز آئی تھی وہاں کھڑکی کے قریب ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا جیسے ہی کمرے میں روشنی ہوئی مجھے کو عدنان سمجھ کر باہر سے کسی نے فائر کر دیا اور ظاہر ہے کہ اب فائر کرنے والا ہاتھوں ہاتھ یہاں لایا جا رہا ہوگا۔“

”کیا تمہارے آدمی یہاں موجود ہیں۔“

”تقریباً پچاس آدمی تاریک کپاؤٹ میں بکھرے ہوئے ہیں۔“

”اوہ! تم واقعی بہت اونچے آدمی ہو۔ بہت ذہین..... مگر اس کتے نے تم پر حملہ کیوں کیا تھا۔“

”سعید بابر میری طرف سے مطمئن نہیں تھا..... وہ جانتا تھا کہ میں اس کی مخالفت ہی میں

تفتیش کرتا رہا ہوں۔“

وہ تینوں پھر نیچے آ گئے۔

”اسٹڈی میں چلو.....!“ فریدی نے تویر سے کہا۔ ”میرے آدمی انہیں وہیں لائیں گے۔“

اسٹڈی میں پہنچ کر وہ بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ باہر روش پر بہت سے قدموں کی

آوازیں سنائی دینے لگیں۔

دوسرے ہی لمحے میں ایک جم غفیر اندر گھس آیا۔ یہ سادہ لباس والے تھے اور انہوں نے

میجر داراب اور سعید بابر کو پکڑ رکھا تھا۔

”آہ..... کرنل صاحب۔“ دفعتاً سعید بابر نے خوشی کا نعرہ لگایا۔

”ہاں.....!“ فریدی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم شاید یہ سمجھے ہو گے کہ یہ تویر کے آدمی ہیں۔“

”جی ہاں..... ہم اُس گول سائے کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ وہ اندر

گھسا اور ایک پائپ کے سہارے دیوار پر چڑھ ہی رہا تھا کہ میجر داراب نے اس پر فائر کر دیا۔

میرا دعویٰ ہے کہ وہ اسی عبارت میں رہتا ہے۔ یہیں..... اور اگر وہ یہیں رہتا ہے تو اس عورت

سے پوچھئے کہ میرے مفلوج بھائی نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ اس نے اُسے فٹ پاتھ پر کیوں

سکا کر مارا..... پوچھئے نا.....!“

”تم نے اس کے سائے کو یہاں کب دیکھا تھا۔“

”ابھی ابھی..... ابھی میجر داراب نے اس پر فائر کیا تھا..... دمنٹ بھی نہ گذرے ہوں گے۔“

”حالانکہ.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”میں اُسے ایک گھنٹہ قبل ختم کر چکا ہوں۔ کیا تم

سائے کی لاش دیکھو گے۔“

”اوہو! تو پھر وہ دوسرا.....!“

”دوسرا آج تک پیدا ہی نہیں ہوا سعید بابر۔“ فریدی بولا۔ ”اور سعید بابر..... اس عورت

نے تمہارے بھائی کو جنم دیا تھا۔ وہ اسی کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے اور تمہاری جائیداد میں

سے اُسے آدھا حصہ یقینی طور پر ملے گا۔“

”پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”تم بیکار اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔“ داراب نے سعید سے کہا۔ ”یہ لوگ ہمیں کسی جال

میں پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

اچانک حمید نے داراب کی پیٹ میں ایک گھونہ رسید کر دیا اور جیسے ہی وہ چیخ مار کر دوہرا

ہوا دونوں ہاتھوں کے گھونے اس کے شانوں پر پڑے اور وہ منہ کے بل فرش پر گر گیا۔

”ہائیں..... ہائیں..... کپتان صاحب۔“ سعید بابر بولا اور حمید کا الٹا ہاتھ اس کے گال پر

پڑا۔

”تم لوگ مفت میں مجھے رات بھر جگاتے رہے ہو۔“ حمید غرایا۔

داراب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بار حمید نے اس کے سر پر ٹھوکر ماردی اور وہ اُسے

گالیاں دیتا ہوا دوبارہ ڈھیر ہو گیا۔

”سعید بابر.....!“ فریدی بولا۔ ”مسلماً براؤن میری قید میں ہے اور اس نے اعتراف

کر لیا ہے۔ اُس کے ایک پاسپورٹ کی تصویر میک اپ میں تھی۔ تم نے بڑا ہڈ اسرار ڈرامہ کھیلنا تھا

اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ تم دونوں کے پاسپورٹ جعلی تھے۔ تم بہت دنوں سے

یہاں آگئے تھے۔ تم ہی فقیر بن کر سڑکوں پر بھیک مانگتے پھرتے تھے پھر ایک دن تم مر گئے۔ تم نے پہلے ہی کسی رشید بابر کے نام یہاں کے بیٹکوں میں رقمیں منتقل کرنی شروع کر دی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ تم یہاں اپنے کسی بھائی کی موجودگی ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ پھر اس کا بھی اعلان چاہتے تھے کہ وہ بھائی مر گیا اور تم اب اپنے باپ کی جائیداد کے تہما مالک ہو۔ تمہیں خدشہ تھا کہ کبھی نہ کبھی تنویر یا عدنان تمہاری افریقہ والی جائیداد کے دعویدار بن جائیں گے۔ بس تم نے فقیر کا بہروپ اختیار کر لیا۔ کچھ اس قسم کی صدائیں لگاتے رہے کہ لوگ تم میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ تم نے اس لئے کیا تھا کہ تمہاری شکل و شبہت اُن کے ذہن نشین ہو جائے۔ لہذا یہی ہوا۔ جب تمہاری تصویر اخبارات میں چھپی تو لوگوں میں حیرت پھیل گئی۔ جب تم نے اپنے بھائی کی کہانی چھیڑی تو کم از کم مجھے بھی یقین ہو گیا کہ وہ تمہارا بھائی ہی رہا ہوگا۔ تم جانتے تھے کہ تنویر سب کچھ سمجھ جائے گی لیکن تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کر سکے گی۔ کیونکہ ایسی صورت میں خود اس کی بھی پول کھل جائے گی۔ تم تو دراصل تنویر کے مرنے کے بعد عدنان کے کسی اقدام کے امکانات پر غور کر رہے تھے۔ تمہاری دانست میں تنویر مرتے وقت ہی عدنان کو اس راز سے آگاہ کر کے کاغذات اُس کے سپرد کرتی۔ تم نے ٹھیک سوچا تھا۔ تنویر حقیقتاً اس بکھیرے کو اپنی زندگی میں نہ اٹھنے دیتی۔ ہاں تو تم ایک فائر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ عدنان کی موت..... اور تمہارے بھائی کی موت کی سرکاری طور پر تصدیق..... اگر ان میں سے ایک کام بھی ہو جاتا تو تمہاری دولت ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی اور عدنان کو تم قتل نہ کر سکتے، تب بھی تمہارا کام بن جاتا۔ اگر عدنان کبھی یہ جھگڑا اٹھاتا بھی تو تم یہ کہہ دیتے کہ یہ آدمی یقیناً اس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے جو تمہارے بھائی کی موت کی ذمہ دار تھی۔ تم نے شروع ہی سے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ کچھ لوگ تمہیں زبردستی یہاں سے واپس بھیجنا چاہتے ہیں۔ اُس دن جب تم کیپٹن حمید کو اپنی روداد سنار ہے تھے تم پر ایک فائر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ فائر تمہارے ہی کسی آدمی نے کیا ہوگا۔ پھر لسلٹی براؤن والا اسٹنٹ سامنے آیا اس کا مقصد بھی محض حالات کو بد اسرار بنانا تھا۔ یعنی تمہاری بد اسرار داستان تمام میں پھیل جائے۔ دوسری طرف تم ہمیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ تمہارے بھائی کی موت کے ذمہ دار لوگوں کی حمایت سے لسلٹی براؤن کا

بھی تعلق ہے اور تمہیں خوف زدہ کرنے کے لئے تمہارے پیچھے لگ رہی ہے تاکہ تم ان حالات سے گھبرا کر یہاں سے بھاگ نکلو۔ آخر میں ہوتا یہ کہ ایک دن لسلٹی بھی غائب ہو جاتی اور تم چوری کی رپورٹ میں ایک بھاری رقم درج کرا دیتے۔ تمہارا کیس اور زیادہ تقویت پا جاتا اور ہمیں اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا کہ وہ فقیر حقیقتاً تمہارا بھائی تھا اور ہم اُس کی موت کی تصدیق کر دیتے۔“

”کیا آپ مجھے کوئی جاسوسی ناول سنار ہے ہیں۔“ سعید بابر مسکرا کر بولا۔ ”یعنی میں ہی اپنا بھائی بنا تھا اور پھر مر بھی گیا..... اور اب یہاں کھڑا جاسوسی ناول سن رہا ہوں۔“

”ابھی راحلہ سے تمہاری شادی نہیں ہوئی۔“ فریدی نے سرد لہجے میں کہا۔

”اس جملے اور اس داستان کا تعلق بھی واضح فرما دیجئے۔“ سعید بابر مسکرا کر بولا۔

”ابے بندر کے بچے.....!“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”اپنی یہ مسکراہٹ بند کر دو، ورنہ داراب کی طرح تمہیں بھی بیہوش کر دوں گا۔“

”تمہذیب کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔“ سعید نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ابھی آپ میرے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکے۔“

”کیا راحلہ کو یہ نہیں معلوم تھا۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کہ تم جس دم کے ماہر ہو۔ تم نے یہ فن ایک ہندو یوگی سے سیکھا تھا۔ تم نے راحلہ کو بھی اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تاکہ وہ تمہارے اس کمال کا تذکرہ کسی سے نہ کرے۔ تمہیں صرف تین چار گھنٹے کے لئے مردہ بننا پڑا تھا۔ جس دم کے ماہر تو کئی کئی ہفتے زمین میں دفن رہتے ہیں اور پھر زندہ نکل آتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تمہاری لاش کے ساتھ تین دوسری لاشیں بھی میڈیکل کالج کو بھیجی گئی تھیں۔ لیکن وہاں صرف تین پہنچیں۔ مردہ گاڑی کھینچنے والوں کو بھی اس پر حیرت تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ انہوں نے چار لاشیں سول ہسپتال کے مردہ خانے سے اٹھائی تھیں لیکن جب انہوں نے میڈیکل کالج میں گاڑی کھولی تو اُس میں تین ہی برآمد ہوئیں۔ اُن سے حماقت یہ ہوئی تھی کہ وہ گاڑی کو ایک گلی میں کھڑی کر کے ایک جگہ جس کے دم لگانے کے لئے رک گئے تھے۔ اسی دوران میں تم گاڑی سے نکل بھاگے، انہوں نے اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا لیکن جب میں

نے تفتیش شروع کی تو انہیں اُگلنا ہی پڑا اور پھر میں نے نیروبی سے بھی تحقیق کی ہے۔ جس دم کی کہانی وہاں کا سراغ رساں بھی سناتا ہے۔ ویسے وہ تمہارے کسی دوسرے بھائی کے وجود کے متعلق خاموش ہے۔ اس کی دانست میں تمہارا کوئی سوتیلا بھائی ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا کیونکہ تمہارا باپ ایک عیاش آدمی تھا۔ بہر حال میں تمہیں اس سارے فراڈ کے الزام میں حراست میں لیتا ہوں اور تم نے یاد ارا ب نے اس وقت عدنان پر گولی چلائی تھی۔“

پھر اُس نے سادہ لباس والوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اُسکے جھکڑیاں لگا دو۔“
سعید بابر خاموش تھا۔

فریدی نے بیہوش داراب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”میں اسے اس لئے حراست میں لیتا ہوں کہ اس نے ایک رات اُسی زہریلے کتے کے ذریعہ میری زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی تھی۔“

اچانک کمرے میں فائر کی آواز گونجی اور انہوں نے تنویر کو زمین پر گرتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پستول تھا۔ فریدی اس کی طرف جھپٹا۔

”فریدی بیٹے!“ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے تمہارے..... کہنے کے مطابق خودکشی کر لی..... میں نے اپنے پستول میں اُف..... یہ گولی..... اسی لئے بچائی تھی..... میں یہ گولی..... کسی وقت..... تم پر بھی..... اُف..... اس..... استعمال کر سکتی تھی۔ مگر..... بیٹے میں تمہیں عدنان کا سر پرست سمجھتی ہوں..... وہ تمہیں بہت پسند کر..... تا..... ہاف.....!“

اس کی گردن ایک جھٹکے کے ساتھ بائیں طرف جا پڑی۔

”تم بھی بھول گئے تھے کہ پستول اسی کے پاس ہے۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ آنکھیں پھاڑے تنویر کی لاش کو گھور رہا تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل سی ہو گئی تھی اور قریب ہی کہیں ایک کتا رو رہا تھا۔

ختم شد